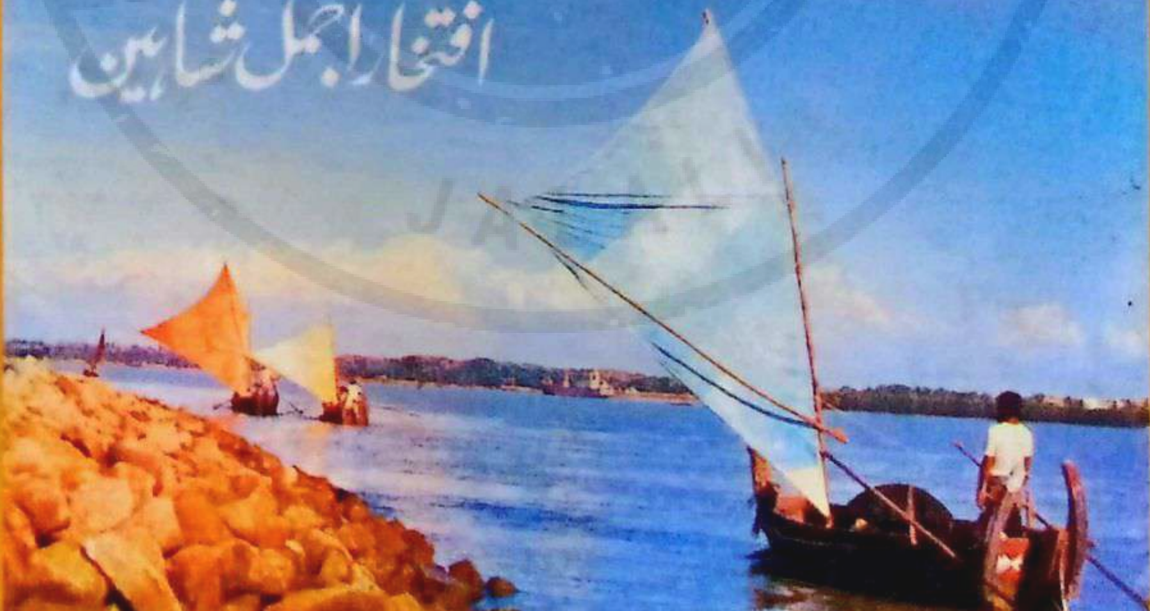
شاعری کا سفر

افتخار اجمل شاہین



شاعری کا سفر

پروفیسر افتخار اجمل شاہینؔ

سابق صدرِ شعبۂ اُردو

ڈی جے گورنمنٹ سائنس کالج، کراچی

☆

اشاعتِ اوّل: فروری ۲۰۰۵ء

طابع: احمد برادرز پریس، کراچی

حروف کار: عامر انصاری

اہتمام: بزمِ شادانی، فلیٹ نمبر: جی ۹، صائمہ کلاسک،
گلشنِ اقبال، بلاک ۱۰/اے، کراچی ۷۵۳۰۰

☆

قیمت: ۲۰۰/روپے

☆☆☆

اپنی شریکِ سفر

اختر جہاں

کے نام

ترتیب

شاعری کے سفر سے آگہی کے سفر تک	پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق	۷
عرضِ سدید	ڈاکٹر انور سدید	۱۷
روودادِ سفر	افتخار اجمل شاہین	۱۹

غزلیں

رفعتِ زندگی نہیں، عظمتِ آدمی نہیں ۳۳

رُخِ روشن کو ہم تو شوق کی تحریر کہتے ہیں ۳۵

خودنگر، بدگماں اور کم حوصلے ۳۷

داغِ دل اپنے دیکھتا کیا ہے ۳۹

مجھے پھر یاد اپنے عشق کا انجام آتا ہے ۴۱

ٹوٹی کشتی، بپھری موجیں، سختیٔ طوفاں بھی ہے ۴۳

اب کہاں جاؤں میں اُٹھ کر تیرے کاشانے کے بعد ۴۵
تصور نے مجھے سپنے دکھائے، تم نہیں آئے ۴۷
عشوہ، غمزہ اور اشارہ چاہیے ۴۹
ڈالی ہے دل میں عشق نے ایثار کی طرح ۵۱
نغمہ کہیں، رباب کہیں، شاعری کہیں ۵۳
نہ مہوشوں کی طرح ہے، نہ گُل رُخوں کی طرح ۵۵
بے وفا سے بھی وفا کی داد پانے کے لیے ۵۷
رُک جاؤ تھوڑی دیر کو، جلدی ہے کیا پڑی! ۵۹
کسی کو داغ اپنے دل کے دکھلانے نہیں جاتے ۶۱
تم سے تو میرے دوست عجب دوستی رہی ۶۳
رقم جب وفا کی حکایت کرے ہے ۶۵
رُک گئے ہیں آپ یوں آ کر مری محفل کے پاس ۶۷
اگرچہ چرخ پہ سورج بھی، ماہتاب بھی ہے ۶۹
جہاں وسعتِ آگہی کا سماں ہے ۷۱
کہاں اب وہ خلوصِ بندگی ہے ۷۳
اُٹھ کر حریمِ ناز سے تنہا نہ آئیے ۷۵
داغ اپنے دل کے سارے دُھل گئے ۷۷
آئینہ تو سب نے توڑا ۷۹
پڑھتا تھا رات دن جنھیں، چہرے وہ ہٹ گئے ۸۱
محبت میں ستم کاری سے بچیے ۸۳
یاد آئے وہ، روز و شب آئے ۸۵

رہنما زردار ناداروں کے بیچ ۸۷
تمھاری یاد میں گر زندگی اپنی بسر ہوتی ۸۹
میں جو خود سے ملا تو خدا مل گیا ۹۱
خود کو خوں میں ڈبو کے آئے ہیں ۹۳
آشاؤں کے دیپ جلا، کیوں نین سے جل چھلکاتا ہے ۹۵
دُکھ کا لاکھ اندھیرا ہو گا ۹۷
اُس کو آخر خراب ہونا تھا ۹۹
گرچہ مشکل ہے راستی کا سفر ۱۰۱
کتابِ زندگانی لکھ رہا ہوں ۱۰۳
ہستی کو آوارہ لکھ! ۱۰۵
اِسی حسرت میں ہم تو زندگی کے دن گزار آئے ۱۰۷
تم کو مرا اندازِ سفر راس نہ آیا ۱۰۹
جب تمیزِ آدمیت کا ہنر آ جائے گا ۱۱۱
مجھے تو یہ جہاں اچّھا لگا ہے ۱۱۳
سلگتی ہے کسی کی یاد دیکھو ۱۱۵
صرف یادوں کا اِک سلسلہ رہ گیا ۱۱۷
غزل جب تک نہ ہم تم کو سُنائیں ۱۱۹
میں دُور رہ کے بھی تجھ کو قریب رکھتا تھا ۱۲۱
حادثہ مجھ پہ بھی کوئی گزرا ۱۲۳
دل ہے زندہ، نہ جان باقی ہے ۱۲۵
اپنا لہو ہے مطلعِ انوار دیکھنا ۱۲۷

پہلے تمھارے حُسن نے آشفتہ سر کیا ۱۲۹
کہانی ہماری مکمل ہوئی ۱۳۱
زخم جگر بھی جاگ اُٹھا تھا ۱۳۳
نج اُٹھے پھر گجر، اور کیا چاہیے! ۱۳۵
وہ غزلیں مری گنگنانے لگے ہیں ۱۳۷
چھوڑا جو سب کو، آ گیا ہوں اپنی راہ پر ۱۳۹
کتنا شاداب ہے، کس قدر دل نشیں، کیسا مہکا ہوا ہے یہ اپنا چمن ۱۴۱
جن کے شاہیںؔ حبیب ہوتے ہیں ۱۴۳
سرحدِ اِدراک سے باہر کبھی آیا کرو ۱۴۵
غم آشنا لمحوں کا اُجالا ہے زمیں پر ۱۴۷
اُس کو سُنا کے اپنی جو ہم داستاں چلے ۱۴۹
یوں تو کہنے کو گھر پہ رہتے ہیں ۱۵۱
جو اندر ہے، باہر دیکھا ۱۵۳
سُنتا ہوں جب تیری باتاں ۱۵۵
اپنے دل کی حکایتیں لکھو! ۱۵۷
جانے والا لوٹ کر آیا نہیں ۱۵۹
اس نگر، اُس نگر میں رہتے ہیں ۱۶۱
رکھ دو اے شاہیںؔ اب تیر و کماں ۱۶۳
حوصلہ بے حساب رکھتے ہیں ۱۶۵
بہت دل گیر ہوتی جا رہی ہے ۱۶۷
ہجر کے قصے بھی ہم لکھتے رہے ۱۶۹

شاعری کرتے رہے ہو عمر بھر ۱۷۱
شاد ہم کو جو خوب رُو کرتے ۱۷۳
دل زخم ترا، آنکھ بھی نم ہے کہ نہیں ہے ۱۷۵
چراغِ مہر و محبت جلائے رکھنا ہے ۱۷۷
مجھے تم سے، تمھیں مجھ سے محبت ہو بھی سکتی تھی ۱۷۹
محنت کشوں کے عزم کی ہیں یہ نشانیاں ۱۸۱
تم جو آئے لوٹ کر، مجھ پر جوانی آ گئی ۱۸۳
ماحول دل شکن سہی، ہمّت جواں رہے ۱۸۵
اُنھیں کو یاد کرتے ہیں سوادِ شام سے پہلے ۱۸۷
شیدا سبھی ہیں اُس کے، وہ صورت غزل کی ہے ۱۸۹
یوں ہے فانی فنا کا شکار آدمی ۱۹۱
خوش رنگ ہم جو منظر باہر کے دیکھتے ہیں ۱۹۳
خطِ معکوس میں وہ لکھتے تھے ۱۹۵
چاہتا ہے مجھ کو وہ دیوانہ وار ۱۹۷
جھولے میں ہم بھنْور کے پڑے ڈولتے رہے ۱۹۹
بچھڑ کر تم سے تنہائی بہت ہے ۲۰۱
کیوں پوچھتے ہو مجھ سے سکندر کی کہانی ۲۰۳
سجا کے لایا ہوں میں نقدِ جاں ہتھیلی پر ۲۰۵
لکھیں گے روز نئی داستان کاغذ پر ۲۰۷
پھر آ گئی بہار، آؤ غزل کہیں ۲۰۹
ہر بشر شادکام ہو جائے ۲۱۱

میں زندہ ہوں اب تک تمھارے بِنا ۲۱۳
پڑھتے رہیے کتاب کی صورت ۲۱۵
میں تو خلوص کا کبھی منکر نہیں رہا ۲۱۷
چھوڑ آئے وہ نگر، ہم کیا کہیں ۲۱۹
یاد جب آتی ہے اُن کی دم بہ دم ۲۲۱
جس کو چاہا تھا، خدا کی شان ہے! ۲۲۳
دوستوں سے کہہ کے غم ہلکا کرو ۲۲۶
محبت کا یہ میری مرثیہ ہے ۲۲۹
یہ ترا بانک پن، یہ رعنائی! ۲۳۲

چند ابتدائی مطبوعہ غزلیں

وفاؤں کے بدلے دغا دینے والے ۲۳۷
بپتا کہیے تو سمجھیں گے بپتا کو افسانے لوگ ۲۳۹
کوئی تازہ غزل سُنا دو نا! ۲۴۱
مجھے وہ نظر عطا کر، کرے جو ترا نظارہ ۲۴۳
ستم اِن کا بھی مجھ پر کم نہیں ہے ۲۴۵
شوق کی منزل سے جب آگے گزر جاتے ہیں لوگ ۲۴۷

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق

شاعری کے سفر سے آگہی کے سفر تک

افتخار اجمل شاہیںؔ مشرقی پاکستان میں بھی اُردو کے شاعروں میں جانی پہچانی شخصیت رکھتے تھے۔ اُن کے ادبی سفر کا آغاز ہندی اور انگریزی کہانیوں کے ترجمے اور طبع زاد افسانہ نگاری سے ہوا، لیکن اپنے ذوقِ طبیعت کی وجہ سے وہ جلد ہی شاعری کی جانب مائل ہو گئے، اُس وقت سے اُن کا یہ سفر جاری ہے۔ افتخار اجمل اُن کا نام اور شاہیںؔ تخلص ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی وہ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ڈھاکا کے سقوط کے بعد افتخار اجمل شاہیںؔ کو بھی دوسری ہجرت کرنا پڑی اور اِس حصّہَ وطن میں، جو اَب کُل پاکستان ہے، اُن کا مسلک درس و تدریس ہی رہا۔ ایک عمر درس و تدریس سے وابستہ رہنے کے بعد وہ ڈی جے سندھ گورنمنٹ کالج سے بہ حیثیت پروفیسر اور صدرِ شعبہَ اُردو سبک دوش ہوئے۔ افتخار اجمل شاہیںؔ نے جس ادبی سفر کا آغاز کیا تھا، وہ کارگر ثابت ہوا۔ اُنھیں پبلسٹی کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر اُن کا نام انٹرنیشنل ڈائریکٹری آف ڈسٹنگوئشڈ لیڈرشپ میں شامل کیا گیا، لیکن وہ یہ خبر لے کر اخباروں کے پیچھے نہیں دوڑے کہ ''بہرِ خدا اِسے بھی کہیں چھاپ دیجیے۔''

کون نہیں جانتا کہ اِس طرح کے سندوں کی حیثیت صرف تجارتی یا کمرشل ہے اور اِس طرح کی خبریں چھپوانے کا جتن کرنا بھی

بدذوقی اور احساسِ تناسب سے محرومی کی دلیل بن جاتا ہے۔

افتخار اجمل شاہینؔ کی شاعری میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تازگی بعض ہندی الفاظ کے استعمال سے بھی آئی ہے اور بعض تازہ خیالات اور رویّوں سے بھی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

بپتا کہیے تو سمجھیں گے بپتا کو افسانے لوگ
شہر میں ہر ہر موڑ پہ دیکھے اِس ڈھب کے فرزانے لوگ

شاہینؔ نے اُردو غزل کی روایات سے بھی کام لیا ہے۔ اُن کے اِس مجموعے میں غزلیں ہی شامل ہیں اور غزل کا شاعرانہ روایات سے گہرا تعلّق ہے۔ شاہینؔ کا اُردو شاعری کا مطالعہ وسیع ہے، لیکن اِن غزلوں میں اُنھوں نے اپنی بات الگ کہنے کا ڈھنگ نکالا ہے۔ اُن کے ہاں ابلاغ کی کوئی مشکل نہیں، کیوں کہ وہ اپنی بات قاری تک پہنچانے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ اُن کا یہ ڈھنگ سادہ اور آسان لفظوں میں مؤثّر اظہار کا ڈھنگ ہے۔ غزل کی روایت سے منسلک رہتے ہوئے اُن کی غزلوں میں مشاہدۂ جمال کے نقوش ملتے ہیں اور شاعرانہ جذبات و کیفیات کی عکّاسی بھی۔ دوسری ہجرت کی کیفیت کے شامل ہونے سے تاریخ کا احساس بھی ہوتا ہے۔ وہ بڑے درد سے کہتے ہیں:

یوں خانماں خراب رہے کوئی کب تلک
کب تک رہے گا جانے یہ ہجرت کا سلسلہ
ہم ہیں، سفر ہے اور ہے یہ دشتِ زندگی
ہے دھول سے لباس ہمارا اَٹا ہوا

لیکن شاہینؔ نے جبرِ حالات کے ظلمت کدے میں دیا روشن رکھا اور دریچہ کھلا رہنے دیا ہے کہ اُس سے تازہ ہوا بھی آتی ہے اور اُمّید کی روشنی بھی۔

غزل میں معاملاتِ محبت کا بیان نہ ہو تو وہ غزل نہیں ہوتی۔ شاہینؔ نے بھی معاملاتِ محبت، لیکن اُن سے زیادہ کیفیاتِ محبت کو پیش کیا ہے۔ اِن کیفیاتِ محبت میں تنوّع ہے، اِس لیے اِن میں دل کشی اور جاذب نظری باقی رہتی ہے؛ مثلاً وہ کہتے ہیں:

شبِ مہتاب کی رعنائیاں رخصت ہوئیں آخر
کئی تارے سرِ مژگاں تک آئے، تم نہیں آئے

سینے میں درد کی جو یہ لہریں ہیں موج زن
دل میں چبھی ہے اُس کی نگہ کی اَنی کہیں

گم صم اُداس رہتے ہو شاہینؔ کس لیے
کچھ تو بتاؤ، کون سی اُفتاد آ پڑی!

افتخار اجمل شاہینؔ کے شاعرانہ مزاج کو بلند آہنگی پسند نہیں، اِس لیے وہ اپنی بات نرمی سے کہتے ہیں۔ ایسی نرمی سے، جو اثر بھی رکھتی ہے اور کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی؛ مثلاً وہ کہتے ہیں:

پڑوسی ترے دھوپ کو ہیں ترستے
بہت تُو نے اونچا بنایا مکاں ہے

شاہینؔ جا کہو یہ مدیرانِ شہر سے
میں اہلِ فن ہوں، میرا بھی نمبر نکالیے

شاہینؔ کی شاعری صرف محبت کی شاعری نہیں، بل کہ اِس میں اُن کے سماجی تجربات اور حسّی اضطرابات کا اظہار بھی ہوا ہے؛ مثلاً:

رہنما زردار ناداروں کے بیچ
ہے عجب کردار کرداروں کے بیچ

شہر ہے آشوب میں ڈوبا ہوا
بے ضرورت گھر سے مت نکلا کرو

شہروں کی روشنی سے تو بنتی نہیں ہے بات
تاریک اپنے گاؤں ہیں، اُن کو اُجالیے

جل جاؤ کڑی دھوپ میں شاہیؔن مگر تم
اپنوں سے نہ مانگو کبھی دیوار کا سایہ

ڈاکا جس نے ڈالا شاہیؔن
گھر کا چوکی دار رہا تھا

افتخار اجمل شاہیؔن کی شاعری میں دو قابلِ ذکر عناصر ہیں: اُن کی جذباتِ محبت کی شاعری میں نغمگی کا احساس ملتا ہے اور اُس کی زبان گیتوں کی زبان سے قریب ہے، مثلاً:

آشاؤں کے دیپ جلا، کیوں نین سے جل چھلکاتا ہے
سب ہیں اپنے اپنے دکھ میں، کون مدد کو آتا ہے
چٹھی تھی اِک آنے والی، آس لگائے بیٹھا ہوں
خط تو ویسے نامہ بر، ہر روز مجھے دے جاتا ہے
ٹوٹ گیا وہ رشتہ دل کا، آنا جانا ختم ہوا
چھت پر میرے بیٹھا کاگا کاہے شور مچاتا ہے

اِس سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شاہیؔن نے بعض ایسے روزمرہ کے مشاہدات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، جنھیں عام طور پر شاعری کے دائرے سے باہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

چھین کر بچّے کو ماں سے لے گئے
واپسی کی شکل اب تاوان ہے!

ہے تقاضا وقت کا شاہیںؔ یہی
جائیے دفتر سے سیدھے اپنے گھر

ایسے بھی کچھ خبیث لٹیرے ہیں شہر میں
کانوں سے چھین لیتے ہیں بچّی کی بالیاں

لاش دریا سے نکلی تھی عورت کی جب
ایک بچّہ بھی لپٹا ہوا مل گیا

دیے جب فال کے پیسے زیادہ
تو حسبِ حال توتا بولتا ہے

چٹھی گُم ہو سکتی ہے
خط اُس کو دوبارہ لکھ!

مل جائے گی ملازمت اب کے برس ضرور
ہر سال میری اہلیہ سنتی یہی رہی

ایسے مشاہدات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا مشکل ہے، اور اِس میں بیسیوں سال سے فکرِ سخن کرتے رہنے والے شاعر بھی عموماً کام یاب نہیں ہوتے، لیکن شاہیںؔ نے شاعرانہ فکر کا کوئی نہ کوئی زاویہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

دراصل زندگی کی ان متناقض صورتوں سے شاہیںؔ کی شاعری میں وسعت آئی ہے اور وہ اُن کے بیان سے آگہی کا سفر بھی طے کرتے نظر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہم سب کو ضرورت تو محبت کی رہی ہے
نفرت کو مگر ہم نے ہی پالا ہے زمیں پر

یہی آ گہی کا سفر، جس میں سماجی آ گہی بھی شامل ہے، اُن سے ایسے اشعار بھی کہلواتا ہے:

فاقے کر کر کے مر گیا ہاری
کھیت بنجر، لگان باقی ہے

اور:

محنت کشوں کے عزم کی ہیں یہ نشانیاں
کیا جھومتی ہیں، دیکھیے، گندم کی بالیاں

اِس کے ساتھ ساتھ وہ اِس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ حالات خود نہیں بدلتے، اُنھیں برسوں کے لیے ایک منظّم جدّ و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ زمانہ تو ہم ہی سے تعبیر ہے، یہ نہ بدلے تو پھر کس کی تقصیر ہے
ہم بدلتے نہیں، چاہتے ہیں یہی، بس زمانہ بدل دے خود اپنا چلن

افتخار اجمل شاہین نے محبّت کے زمزمے بھی سُنے ہیں اور رفتہ رفتہ مسائلِ حیات تک بھی پہنچے ہیں۔ حقیقت کی تلخیوں نے اُنھیں آ گہی کا درس دیا ہے، اور زندگی کا ادراک و شعور یقین ہے کہ اُن کی شاعری کو نئے فنّی مدارج عطا کرے گا۔ میں اُن کے نئے مجموعۂ کلام کا منتظر ہوں۔

عرضِ سدید

مشاعروں کی افراط کے حالیہ دور میں اچانک یوں ہوا کہ غزل کی مخاصمت آمیز مخالفت کی ہوا چل پڑی۔ مقصد شاید یہ تھا کہ غزل کی ہوا اکھاڑ کر نظم کی ہوا باندھی جائے لیکن یہ بات نظرانداز کردی گئی کہ غزل کے ریاض کے بغیر اچھی نظم کہنا آسان کام نہیں۔ غزل کی تہذیب کئی صدیوں پر محیط ہے اور کئی زمانے گزر جانے کے باوجود شعرانے غزل میں احساس و ادراک کے دھارے کو مسلسل موج زن رکھا۔ صنفِ غزل کی کام یابی کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی سترھویں صدی میر تقی میر اور اٹھارویں صدی اسد اللہ خاں غالب اور بیسویں صدی علامہ اقبال سے منسوب ہے۔ دوسری طرف یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ کثرتِ تخلیق کے باوجود صنفِ غزل کہیں جمود کا شکار نہیں ہوئی، حالاں کہ انجمنِ پنجاب لاہور کے مشاعروں نے جدید نظم کو متعارف کرانے کے لیے جس سلسلے کا آغاز کیا تھا، اُس پر اب سوا سَو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ہنوز اُردو نظم کے ارتقا کا سلسلہ جاری ہے، جب کہ غزل کی استقامت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور اُسے اپنے صنفی وجود میں ایک ثقافت کا درجہ بھی مل چکا ہے۔

یہ چند باتیں پیش کرنے کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ غزل کی متذکرہ مخالفت کی لہر میں مجھے پروفیسر افتخار اجمل شاہیؔن کی غزلوں کی کتاب

''شاعری کا سفر'' پڑھنے کا موقع ملا اور مجھے اُن کے ہاں تازگی کا نرالا اور توانائی کا جداگانہ زاویہ نظر آیا۔ میں نے مختلف رسائل اور جرائد میں اُن کی نظمیں بھی پڑھی ہیں، بلاشبہ وہ شخصی اظہار کے لیے نظم کا پیکر بھی ندرت آفریں انداز میں تشکیل دیتے ہیں، مگر غزلوں کی زیرِ نظر کتاب یہ حقیقت آشکار کرتی ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کا تخلیقی سفر غزل کی معطّر ثقافت میں طے کیا ہے اور مظاہر، مناظر، اشیا، واقعاتِ زمانہ اور حالاتِ عصر سے جو انوکھا تاثّر کشید کیا، اُسے آگہی کا ایک ایسا تجربہ بنا دیا جس سے نہ صرف اُن کا عہد، بل کہ آنے والا زمانہ بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ ایک باشعور ادیب کی حیثیت میں اُنھوں نے اپنے گردوپیش کا خردمندانہ مشاہدہ کھلی آنکھوں سے کیا، لیکن اُس کے ثمرات اپنی ذات تک محدود رکھنے کے بجائے اُنھیں شعر کا جامہ پہنایا اور پھر اُنھیں خلقِ خُدا میں بے دریغ تقسیم کر دیا۔ اُن کی شاعری کا رُخ اپنی ذات سے معاشرے کی طرف ہے۔ مجھے اُن کی شاعری پر مولانا الطاف حسین حالؔی کا سایہ پَرافشاں نظر آتا ہے۔ چناں چہ اُن کے دل کے جزیروں سے جو بات مصرعِ تر کی صورت اختیار کرتی ہے، اُس میں اُن کا سیروں خون شامل ہوتا ہے، اُنگلیاں فگار نظر آتی ہیں، خامہ خوں چکاں دکھائی دیتا ہے، لیکن اُس میں معاشرتی اصلاح کی خواہش بھی نمایاں طور پر موجود ہوتی ہے۔

افتخار اجمل شاہیؔن کی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے شعر کہتے وقت سادگی کے غیرمروّج پیمانوں سے فسوں کاری پیدا کی، لیکن اِس عمل کے دوران اپنے بوقلموں اور متنوّع جمالیاتی زاویوں کو بھی آشکار کر دیا۔ اُن کی شاعری کا سفر دراصل اُن کی زندگی کے تجربات، احساسات اور ادراکات کا سفر ہے، جس کے پورے مطالعے کے لیے میں آپ کو یہ کتاب پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔

افتخار اجمل شاہین

رودادِ سفر

میں نے کب سے شعر کہنا شروع کیا، یہ اچھی طرح یاد نہیں، مگر اِتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی غزل ۱۹۶۲ء میں کہی تھی اور ۱۹۶۳ء میں یہ غزل کسی اخبار کے ادبی صفحے پر شائع ہوئی تھی۔ پھر یہی غزل چند مہینوں کے بعد چاٹگام کے ایک ہفتے وار ''پیامِ مشرق'' میں شائع ہوئی۔ اُس وقت اُس کے مدیر کاوش عمر تھے۔ شعرگوئی سے پہلے شعر پڑھنے اور سُننے کا شوق تھا اور یہ سلسلہ۱۹۵۶ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اچھا شعر سنتا تو ایک طرح کا ذہنی سکون یا ذہنی مسرت ملتی تھی۔ خاص طور پر ایسے اشعار جن میں روانی اور نغمگی ہوتی تھی وہ بہت پسند آتے تھے۔ مثلاً جب میں میٹرک کا طالبِ علم تھا تو علامہ اقبال کے چند دیگر اشعار کے ساتھ ساتھ یہ دو اشعار مجھے بہت پسند تھے، حالاں کہ اُس وقت اِن کا مطلب بھی ٹھیک طور سے نہیں سمجھتا تھا:

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اُس وقت اِن کی پسندیدگی کی وجہ شاید میرے نزدیک یہی تھی کہ اِن اشعار میں غنائیت کا بھر پور عنصر شامل تھا۔ چھٹی جماعت کے اُردو کے

نصاب میں حفیظ جالندھری کی حمد ''اے دو جہاں کے والی'' شامل تھی۔ یہ حمد مجھے زبانی یاد ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ اِس میں روانی اور نغمگی کا بھرپور عنصر پایا جاتا ہے۔ یہ دُعا مجھے ڈی ایم اسکول کے ہیڈ مولوی جناب ابنِ حسن نے پڑھائی، جو پروین شاکر کے چچا تھے۔ یہ حمد اُنھوں نے خود پڑھی، کئی طلبہ سے پڑھوائی، پھر اِس کی تشریح نہایت مؤثر اور دل نشیں انداز میں کی۔ اِس طرح شعر خوانی سے رغبت اور دل چسپی پیدا ہوئی۔ اِس کے علاوہ گھر کے اندر اور گھر کے باہر شعر خوانی کا چرچا عام تھا۔ گھر والے اہلِ علم اور باذوق حضرات اکثر اپنی گفتگو میں اشعار کا حوالہ دیتے تھے۔ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ قوّالی کی محفلیں بھی ہوتی تھیں، جن میں اکثر عمدہ غزلیں سُننے کا موقع ملتا تھا۔ اِس طرح میرے اندر بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور میں کبھی کبھی ایک آدھ شعر کہنے لگا، پھر مکمّل غزلیں بھی کہنے لگا، اور جب غزلیں شائع ہونے لگیں تو میرا حوصلہ اور بھی بڑھا۔

میری پہلی غزل، جس کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ بعد میں، غالباً ۱۹۷۶ء میں، روزنامہ ''جسارت'' کے ادبی صفحے پر شائع ہوئی۔ اِس اخبار کے ادبی صفحے کے نگراں نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا، یعنی کسی شاعر کی پہلی غزل اور تازہ ترین غزل ''کل اور آج'' کے عنوان سے شائع ہوتی تھی۔ اِس میں میری پہلی غزل کے ساتھ تازہ ترین غزل شائع ہوئی۔ تازہ ترین غزل کا ایک شعر تھا:

تم بھی شاہیں مقام پا لو گے
جاری رکھو یہ شاعری کا سفر

تو مدیرِ نگراں نے اِس سلسلے کا عنوان 'کل اور آج' سے بدل کر 'شاعری کا سفر' رکھ دیا۔ اب یہی عنوان یا نام میرے شعری مجموعے کا بھی ہے۔

شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا، مگر شعر کہنے کی رفتار بہت سست تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں شاعری کے مقابلے میں نثر زیادہ لکھتا تھا، بل کہ اُردو شاعری سے پہلے میں نے انگریزی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُس وقت میں بی اے آنرز کا طالب علم تھا۔ کئی انگریزی نظمیں ''ینگ پاکستان'' (Yoyng Pakistan) میں شائع ہوئیں۔ یہ پرچہ ڈھاکا سے شائع ہوتا تھا اور اِس کے مدیر عزیز احمد بالیمینی تھے۔ ٹامس انجیل (Thomes Angel) نے میری ایک نظم ''تھیم آف لائف'' (Theme of life) کو بہترین نظم قرار دے کرانعام کا بھی اعلان کیا تھا، مگر وہ انعام ڈھاکا سے پٹنہ نہیں پہنچ سکا۔

بعد میں میرے احباب نے مشورہ دیا کہ اُردو میں کلام کہنا زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ اُردو مادری زبان ہے اور انگریزی زبانِ غیر، اس لیے اِس زبان میں مہارت اور پذیرائی حاصل کرنا مشکل ہے۔ ایک دو غزلیں فارسی میں بھی کہی تھیں۔ اُن میں سے ایک غزل خانۂ فرہنگِ ایران، ڈھاکا کی ایک ادبی محفل میں پڑھی تھی، جس کی صدارت ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کی تھی۔ اُس مشاعرے میں گلنار آفریں نے بھی اپنا کلام سُنایا تھا۔ میرے لکھنے کا سلسلہ نثرنگاری سے شروع ہوا اور اب بھی میں زیادہ تر نثر ہی لکھتا ہوں، یعنی تبصرے، جائزے، تنقیدی مضامین وغیرہ۔ مطبوعہ مضامین کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ میرے مضامین کے موضوعات زیادہ تر شعرا اور اُن کی شاعری رہی ہے۔

میں نے ادبی مسائل پر بھی لکھا ہے، مگر اُن مضامین کی تعداد کم ہے۔ کچھ مضامین اُردو افسانے پر لکھے ہیں اور چند افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اِس موضوع پر ایک علاحدہ کتاب شائع کرنے کا اِرادہ ہے

کیوں کہ مضامین میں نے کثرت سے لکھے ہیں، بل کہ اس طرح کئی مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ میں نے اِس سلسلے میں کام شروع بھی کر دیا ہے۔

میں جب تک عظیم آباد میں رہا، کسی بھی مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے شریک نہیں ہوا۔ وہاں کی کئی نشستوں میں ادب سے متعلق مضامین میں نے ضرور پڑھے اور وہاں کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضامین شائع ہوئے۔ بعض ہندی اور انگریزی افسانوں کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ جو ماہ نامہ ''شاعر'' (بمبئی) اور ماہ نامہ ''اشارہ'' (پٹنہ) میں شائع ہوئے، مگر جب میں چاٹگام آیا تو شعری محفلوں میں شرکت کرنے لگا۔ اُس سے پہلے شیخ پورہ کی ایک دو شعری محفلوں میں اپنا کلام سنایا تھا۔

چاٹگام میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا۔ اکثر شعری نشستوں کا انعقاد ہوتا اور مشاعرے برپا ہوا کرتے تھے۔ چاٹگام میں شعرا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اُردوداں شعرا کے ساتھ چند بنگالی نژاد شعرا بھی تھے جو اُردو میں شاعری کرتے تھے۔ اُردو کے ادبی پرچے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ چند ادبی پرچوں کے نام یاد آ رہے ہیں: ماہ نامہ ''روش''، سہ ماہی ''خرام''، ماہ نامہ ''کرنافلی''، ماہ نامہ ''سیما'' اور ہفت روزہ 'پیامِ مشرق'۔

چاٹگام کے قابلِ ذکر شعرا میں پروفیسر اقبالؔ عظیم، جو بعد میں ڈھاکا چلے گئے، پروفیسر حسنؔ عظیم آبادی، کاوشؔ عمر، مبارکؔ مونگیری، پروفیسر عثمان رمزؔ، اصغر راہیؔ، اصغرؔ گورکھ پوری، جمیلؔ عظیم آبادی، شوقؔ شاکری، انورؔ شاکری، جبّارؔ لطیفی، منوّرؔ فیضی، عابد معبودؔ (بنگالی نژاد)، دلیلؔ ناطقی (بنگالی نژاد)، صادقؔ بنارسی، قدّوسؔ صدیقی، مقبول نقشؔ، اصغرؔ مینائی، نیّرؔ احمری، ثناؔ گورکھ پوری اور غالب عرفانؔ شامل ہیں۔

اِس کاروان میں بعد میں جمیل یوسف بھی شامل ہو گئے۔ اُن کا تبادلہ مغربی پاکستان سے چاٹگام میں ہوا تھا۔ جب اُن کا تبادلہ مشرقی پاکستان میں ہوا تو اُن کی بیگم بہت خوش تھیں کہ اب اُن کو شاعروں اور مشاعروں سے نجات مل گئی، اور اب دستکِ نیم شبی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، مگر اُن کی رہائش گاہ پر جو پہلی شعری نشست ہوئی، اُس میں تیس پینتیس شعرا نے شرکت کی، وہ اِس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

جمیل یوسف اُس وقت چاٹگام کنٹونمنٹ میں افسرِ انتظامیہ تھے۔ اُن کی آمد سے چاٹگام کی شعری محفلوں میں جان پڑ گئی۔ اُن سے میری اکثر ملاقات رہتی۔ اُن کے پاس مغربی پاکستان کے تمام قابلِ ذکر رسالے آتے تھے۔ اِس طرح اُن رسالوں کو پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملتا، نیز اُن سے علمی و ادبی گفتگو بھی ہوتی۔ سی ایس ایس کرنے سے پہلے وہ رحیم یارخان میں تاریخ کے لیکچرر تھے اور ایک کتاب ''بابر سے ظفر تک'' لکھ چکے تھے۔ اُن کے دوشعری مجموعے چاٹگام میں پایۂ تکمیل کو پہنچے جو بالترتیب ''شہرِ غزل'' اور ''نذرِ غالب'' کے ناموں سے شائع ہوئے۔

میں جب پاکستان آیا تو میں نے عارضی طور پر اسلامیہ ماڈل اسکول میں پڑھانا شروع کیا، جہاں مجھ سے پہلے ڈاکٹر منظورالدین احمد (سابق وائس چانسلر، جامعۂ کراچی) بھی بحیثیت ہیڈماسٹر اپنے فرائض انجام دے چکے تھے، پاکستان آنے سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ وہاں فارسی کا بھی بول بالا ہوگا، اور یہ مضمون ہر کالج میں پڑھایا جاتا ہوگا، مگر مجھے مایوسی کا سامنا ہوا۔ اس لیے بعد میں مجھے اُردو میں بھی ایم اے کرنا پڑا، مگر فارسی میں آنرز اور ایم اے دونوں میں میری فرسٹ کلاس تھی، اس لیے سینٹرل گورنمنٹ اسکول بحیثیت استاد کے انتخاب میں اُس سے مدد لی۔ میرے مقابلے میں ایک

دوسرے صاحب بھی تھے اور ڈائریکٹوریٹ والے اُنھیں پروانۂ تقرری دینا چاہتے تھے، مگر ڈپٹی ڈائریکٹر اکرام صاحب نے بنگلہ میں اپنے ماتحت سے کہا کہ اِن کو تقرّری کا کاغذ دیں، کیوں کہ اِن کی فرسٹ کلاس ڈگری ہے۔ فارسی زبان میں ایم اے کرنے کا ایک اَور فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مجھے حکومتِ ایران نے ڈاکٹر یٹ کرنے کے لیے اسکالرشِپ بھی دی، مگر والدین کی شدید علالت کی وجہ سے میں ایران نہ جا سکا۔ میرے ساتھ ہی ڈاکٹر روشن آرا، ڈاکٹر منیر احمد، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، ڈاکٹر ریاض احمد اور ڈاکٹر صدیق شبلی کو بھی یہ اسکالرشِپ ملی اور اِن لوگوں نے اُس کا فائدہ اٹھایا۔ مجھے اللّٰہ تعالیٰ نے جلد ہی اِس کا نعم البدل عطا کر دیا، یعنی میں نے جب اُردو میں ایم اے کر لیا تو پبلک سروس کمیشن کی طرف بحیثیت لیکچرر میرا انتخاب ہو گیا اور میں گورنمنٹ کالج آف کامرس، چاٹگام میں سقوطِ ڈھاکا تک پڑھاتا رہا۔

چوں کہ میرا انتخاب کمیشن سے ہوا تھا، اس لیے میں بے فکر ہو کر چاٹگام چلا گیا۔ ایڈہاک تقرّری کا وہاں رواج نہیں تھا اور پرنسپل حضرات اِس قسم کی تقرّری نہیں کرتے تھے۔ میں نے کالج جوائن کر لیا، اُس کے بعد اُس کالج کے پرنسپل شفاعت احمد صدّیقی صاحب سے پوچھا کہ کیا کسی رجسٹر (muster roll) پر بھی دست خط کرنا ہے؟ تو اُنھوں نے کہا:

Gazetted officers do not sign, they are trusted.

حالاں کہ اُس وقت لیکچرر سیکنڈ کلاس گزیٹڈ افسر ہوا کرتے تھے۔ پھر پرنسپل صاحب نے کہا کہ کالج کے اوقاتِ کار صبح نو بجے سے چار بجے شام تک ہیں۔ آپ کس وقت آنا پسند کریں گے؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ آپ کے لیے ایک بجے سے پہلے کا وقت ٹھیک رہے گا۔ میں نے ہامی بھر لی اور ٹائم ٹیبل نوٹ کر لیا۔ اُس وقت اُردو کے سینیئر اُستاد پروفیسر حسن عظیم آبادی

صدرِ شعبۂ اُردو تھے۔ پرنسپل صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہاں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر کسی دن کلاس نہیں ہے تو نہیں بھی آ سکتے ہیں، مگر کسی بھی حالت میں کلاس چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ کلاس چھوڑنا، یعنی کلاس کو اِنگیج (engage) نہ کرنا بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ اِس بات کا آپ خاص خیال رکھیں کیوں کہ اِس سلسلے میں یہاں سختی برتی جاتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہر اُستاد اپنی اپنی کلاسیں پابندی سے لیتا ہے۔ کوئی اُستاد اگر کبھی کلاس میں دیر سے پہنچتا تو پرنسپل کو خبر ہوجاتی تھی۔ وہ خود بھی راؤنڈ لیا کرتے تھے۔ اِس طرح کالج کا تدریسی نظام نہایت عمدہ طریقے سے جاری تھا۔ طلبہ اساتذہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اِس کالج میں چار پانچ ایسے اساتذہ تھے جنھوں نے ایم کام کے ساتھ ایم بی اے بھی کیا تھا اور وہ بھی امریکا سے۔ اُن سے پہلے ایم آر صدیقی نے چھ مہینے تک پڑھایا تھا، جو سی اے تھے اور جو بعد میں مشہور صنعت کار اے کے خان کے داماد ہوئے۔

اے کے خان کا شمار بنگال کے مشہور صنعت کاروں اور رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے غالباً ۱۹۶۹ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان میں بارہ صوبے بنا دیے جائیں؛ چار مشرقی پاکستان میں اور آٹھ مغربی پاکستان میں۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا تو مشرقی پاکستان علاحدہ نہیں ہوتا۔ آخر ہندوستان میں صوبے بن ہی رہے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے تین صوبے بن گئے، اور ابھی حال ہی میں بہار کے اندر دو صوبے بن گئے، ایک بہار اور دوسرا جھاڑکھنڈ، یہ بات ضمنی طور پر میں نے لکھ دی۔ آمدم برسر مطلب! یہاں پر اِس بات کی وضاحت کر دوں کہ مذکورۂ بالا اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ جزوقتی لیکچرر نہ تھے، بل کہ مستقل سرکاری ملازم تھے۔ ایسا ضرور تھا کہ اُن

کی قابلیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُن کو اضافی اِنکریمنٹ دی گئی تھی، یا بعض صورتوں میں اُن کی تقرری ایک درجے اوپر کے عہدے پر ہوتی تھی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے اگر کوئی ایم کام اور ایم بی اے کسی فرم یا بینک کی ملازمت کرتا تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتا، مگر وہاں تدریس کے پیشے کو معزز پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ مجھے خود ایک نجی ادارے میں کلرکی مل رہی تھی، جہاں تن خواہ زیادہ تھی، مگر میرے رشتے داروں نے کہا کہ کلرکی سے بہتر ہے کہ کسی اسکول ہی میں پڑھاؤں۔ چناں چہ میں نے یہی کیا۔ بعد میں مجھے کالج کی ملازمت مل گئی۔ یہاں پر اِس بات کی وضاحت بھی کردوں تو نامناسب نہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں نور کمیشن کی رُو سے ۱۹۷۱ء ہی سے لیکچرر کو کلاس وَن کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اور نیا پے اسکیل بھی ملا تھا، جب کہ موجودہ پاکستان (سابقہ مغربی پاکستان) میں اِس کا اطلاق ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ نیز مشرقی پاکستان میں بی اے (آنرز) اور ایم اے میں ہر فرسٹ کلاس ڈگری پر ایک اضافی اِنکریمنٹ بھی دیا جاتا تھا، مگر شرط یہ تھی کہ اُس مضمون میں فرسٹ کلاس ہونا ضروری تھا، جس مضمون کا وہ لیکچرر تھا۔ نیز وہاں کے بنیادی اسکیل میں بھی ابتدا ہی سے فرق تھا۔ وہاں لیکچرر کا اسکیل ۳۷۵؍ رُپے سے شروع ہوتا تھا جب کہ مغربی پاکستان میں ۳۵۰؍ رُپے سے شروع ہوتا تھا۔

میرے کالج، یعنی گورنمنٹ کالج آف کامرس سے ایک سالانہ مجلّہ بھی شائع ہوتا تھا جس کا ایک حصّہ اُردو کے لیے وقف تھا۔ اِس حصّے کی ذمّے داری مجھے سونپی گئی کیوں کہ پروفیسر حسن عظیم آبادی بصارت سے محروم ہو چکے تھے، تاہم پرنسپل نے کہا کہ اُردو کے حصّے کے نگران کے طور پر پروفیسر حسن عظیم آبادی ہی کا نام ہوگا۔ پرنسپل صاحب نے پروفیسر صاحب

کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ صرف آسان اُردو کی کلاس لیں اور گھر چلے جائیں۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ پروفیسر حسنؔ صاحب ایک طرح سے معذور ہیں، اِس لیے مجھے اور آپ کو اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔

This may be with me, with you or with anybody.

ہر سال سالانہ تقریبات ہوتی تھیں، جن میں مباحثے، ڈرامے، موسیقی، غزل خوانی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اُردو مباحثے، غزل اور موسیقی کے پروگرام مَیں ترتیب دیتا تھا۔ ڈراما بھی اُن تقریبات کا اہم حصّہ تھا۔ موسیقی اور ڈراما وہاں کی تہذیب و ثقافت سے زیادہ قریب تھے، اِس لیے میں اُن پر بطورِ خاص توجّہ دیتا تھا۔ بنگالی طلبہ بھی اُردو غزل کا پروگرام پسند کرتے تھے، اور ڈرامے بھی شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اِس سلسلے میں پرنسپل صاحب کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ ایک بار جب اِس مد میں پیسوں کی کمی ہوئی اور بنگالی کے بعض پروفیسروں نے کہا کہ بنگالی پروگرام سے بہت کم پیسے بچتے ہیں لہٰذا اُردو کے لیے زیادہ پیسے نہیں دیے جا سکتے۔ تو پرنسپل صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ ایک ''بزمِ اُردو'' قائم کر لیں۔ اِس طرح آپ اشتہارات کے ساتھ ساتھ کالج کے باہر سے بھی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا۔

دوبارہ چاٹگام آنے سے پہلے میں چوں کہ کئی سال تک ڈھاکا میں رہ چکا تھا۔ جامعۂ ڈھاکا سے اُردو میں ایم اے کیا تھا۔ نیز سینٹرل گورنمنٹ اسکول موتی جھیل ڈھاکا میں تین سال تک پڑھایا تھا، اِس لیے وہاں بھی احباب کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ شعرو ادب سے مجھے فطری دل چسپی تھی، اِس لیے وہاں کے تقریباً تمام قابلِ ذکر شعراو ادبا سے تعلّقات پیدا ہو گئے تھے۔ ڈھاکا مشرقی پاکستان میں شعرو ادب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

وہاں ادبی محفلوں اور شعری نشستوں کا زور زیادہ تھا، اس لیے میں چاٹگام سے ڈھاکا بھی جاتا رہا۔ گرمیوں کی چھٹیاں میں وہیں گزارتا تھا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کو ادبی لحاظ سے ڈھاکا میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے دولت کدے (۳۱ رنیل کھیت) میں ہر سال طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ اُن مشاعروں میں شرکت کو لوگ اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ جب پہلی بار مجھے اُن کے ہاں کے مشاعرے کی دعوت ملی تو میرے دوست احسن محبّ (صدرِ گلشنِ ادب) نے کہا کہ اب تمھیں شاعر ہونے کی سند مل گئی۔ مجھے اُن کے ہاں دو طرحی مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ شادانی صاحب کے ہاں منعقدہ مشاعروں میں صرف معتبر اور معروف شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا۔

ڈھاکا کے معروف شاعر افسر ماہ پوری اُن مشاعروں کا انتظام کرتے اور وہی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اُن مشاعروں میں گلنار آفریں اور جمیل یوسف نے بھی کئی بار شرکت کی۔ ڈھاکے میں شعرا کی تعداد بہت زیادہ تھی، کیوں کہ یہ بڑا شہر تھا اور ادب و ثقافت کا مرکز تھا۔ ڈھاکا کے معروف شعرا میں پروفیسر اقبال عظیم، عابد داناپوری، پروفیسر ارشد کاکوی، افسر ماہ پوری، پروفیسر اظہر قادری، آصف بنارسی، سلیم اللہ فہمی، امیرالاسلام شرقی، علامہ تمنّا عمادی، شہاب الدین رحمت اللہ، پروفیسر احسن احمد اشک، حافظ ظہورالمبارکی، سرور بارہ بنکوی، پروفیسر نظیر صدیقی، پروفیسر مظفّر حسین رزمی، ڈاکٹر حنیف فوق، قاری اخلاق احمد سالک، صادق القادری، پروفیسر فروغ احمد، عطاء الرحمان جمیل، حافظ دہلوی، عطا آصفی، اختر پیامی، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، خواجہ ریاض الدین عطش، رضادائروی، سیف حسن پوری، اختر لکھنوی، اختر آصفی پشاوری، ولی عالم شاہین، ڈاکٹر عبدالماجد اختر،

صلاح الدین محمد، عمران فرحتؔ، ادیبؔ کاکوی، نوشاد نوری، خلشؔ کلکتوی، احمد الیاس، پروفیسر ہارون رشید، وحید قیصر ندوی، منظر علی خان منظرؔ، خواجہ منظر حسن، انور فرہادؔ، ہلالؔ جعفری، نعیم بازید پوری، واحدؔ نظامی، شریرؔ جعفری، شمیم آنولوی، اخترؔ آنولوی، ثناء الحسن ثناؔ، پروفیسر شمس الہدیٰ عزیزی، ذکی آذر، سمیع الحق، اعجاز الحق اعجازؔ، صباؔ اکرام، فرقانؔ ادریسی، شفیق احمد شفیق، بلقیس بانو یادؔ، شمیم نسرینؔ، جہاں آرا چوہدری، حریم عارف، احسن محبؔ، حیاتؔ نظامی، حصیرؔ نوری، رفیع الدین رازؔ وغیرہ قابلِ ذکر شعرا تھے۔ (یہ نام جیسے جیسے یاد آتے گئے، لکھتا گیا۔ ترتیب کا خاص خیال نہیں کیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ شعرا کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔)

جو شعرا ۱۹۷۰ء کے بعد ابھر کر سامنے آئے، ان میں رفیع الدین رازؔ، حصیرؔ نوری، اور غالب عرفانؔ (چاٹگام) کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد جو شعرا و ادبا رہ گئے، وہ اپنی بساط بھر اُردو کی محفلیں سجاتے رہے۔ بعض ادبی رسالے بھی شائع ہوئے۔ ایسے مدیروں میں ذاکرؔ عزیزی اور ایوّب جوہرؔ کے نام خاص طور پر یاد آرہے ہیں۔ اب بھی ڈھاکا سے اُردو کا ایک ادبی رسالہ ''ادب'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے، جس کے مدیر جلالؔ عظیم آبادی ہیں۔ دبستانِ ڈھاکا نے اپنی جداگانہ حیثیت حاصل کرلی تھی، اگر یہ محفل نہ اُجڑتی تو یہاں پہلے سے زیادہ بساطِ سخن سجتی اور شعر وادب کا چرچا ہوتا۔ اُس دیار کے بیشتر شعرا و ادبا کراچی آ گئے ہیں، اور یہاں شعر وسخن کی محفلوں میں اپنے ادب پاروں سے شعر و ادب کے دامن کو وسیع تر کرنے کی کوشش میں مصروف اور سرگرداں رہ کر اپنے وجود کا بھرپور ثبوت دے رہے ہیں۔

آخر میں، مَیں اپنے اُن احباب کا بطورِ خاص شکریہ ادا کروں گا

جنھوں نے اِس کتاب کی اشاعت کے لیے مجھے آمادہ کیا، اور اپنے قیمتی مشورے دیے۔ اُن میں سہیل غازی پوری، شمی فاروقی، جمیل عظیم آبادی، خواجہ منظر حسن اور صدیق فتح پوری کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے بار بار میری توجہ اس کتاب کی اشاعت کی طرف دلائی۔ اپنے کرم فرما احمد حسین صدّیقی کے لیے اظہارِ ممنونیت واجب ہے، جنھوں نے نہ صرف اس کتاب کی اشاعت پر زور دیا، بل کہ انتہائی محبت سے سرورق بھی بنایا۔

غزلیں

رفعتِ زندگی نہیں، عظمتِ آدمی نہیں
ایسے جہاں میں زندگی، جبر ہے، زندگی نہیں

راہوں میں تیرگی وہی، ظلمتوں کی روش وہی
کہتے ہیں، صبح ہو گئی، صبح مگر ہوئی نہیں

بزمِ طرب کی صحبتیں، گزری ہوئی وہ ساعتیں
دیکھے تھے کیا حسین خواب، اب تو وہ یاد بھی نہیں

اشک ابھی سے کیوں تری آنکھوں میں تیرنے لگے
ہم نے تو داستانِ دل کچھ بھی ابھی کہی نہیں

دُور کہیں لگی ہے آگ، ہے یہ اُسی کی روشنی
ہاں، نہ فریب کھائیو، دوست یہ چاندنی نہیں

بیٹھیے اور ابھی ذرا، جلدی کہاں کی ہے پڑی
تشنۂ دید کی نظر سیر ابھی ہوئی نہیں

شاہیںؔ نہ دل گرفتہ ہو، نظمِ حیات ہے یہی
غم سے جو بے نیاز ہو، ایسی کوئی خوشی نہیں

❁

رُخِ روشن کو ہم تو شوق کی تحریر کہتے ہیں
تمھاری ہر ادا کو حسن کی تفسیر کہتے ہیں

خوشی سے خط پڑھا، غصّے میں آئے، چاک کر ڈالا
یہ ہے تحریر کا جادو، اِسے تاثیر کہتے ہیں

مقدّر میں نہیں گر دولتِ دنیا تو کیا غم ہے!
سکونِ قلب کو ہم حاصلِ تحریر کہتے ہیں

یہ تجریدی نمونے بھی، نمونے ہیں قیامت کے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر تصویر کہتے ہیں

نہ سمجھا تھا، نہ سمجھانے کے قابل ہیں، نہ سمجھیں گے
نرالی ہے زباں اُن کی، نئی تفسیر کہتے ہیں

وہ منصوبہ مکمّل ہے، نہ ہے اُس پر عمل کوئی
نہ اُس کو خواب کہتے ہیں، نہ ہم تعبیر کہتے ہیں

وہ گیسو جس کے سائے کی طلب ہے آج شاہیں کو
اُسے اہلِ محبت پاؤں کی زنجیر کہتے ہیں

خود نگر، بدگماں اور کم حوصلے
کیا بتاؤں، مجھے لوگ کیسے ملے

راہِ الفت میں غم سے نہیں ہے مفر
کوئی دامن بچا کر کہاں تک چلے

تحفۂ غم کبھی تو کبھی سرخوشی
دوستو، موت تک ہیں یہی سلسلے

عزم ہو گر جواں، دُور منزل نہیں
اُٹھ گئے جب قدم، گھٹ گئے فاصلے

ظلمتیں راہ کی دُور ہوتی گئیں
مشعلِ عزم لے کے جو ہم بڑھ چلے

ہو خدا پر یقیں اور عمل پہ نظر
کام یابی کے ہیں بس یہی مرحلے

اُن سے اُتنا ہی خطرہ ہے اے دوستو!
دیکھنے میں جو لگتے ہیں جتنے بھلے

کس تمنّا سے آیا تھا اِس شہر میں
خاک میں مل گئے دل کے سب ولولے

پھر یہ سوچوں، زمانے سے کیا ہے ملا
دردِ دل، رنج و غم سے جو فرصت ملے

وہ بھی کہتے ہیں شاہیںؔ مٹا کر مجھے
ہیں تمھاری وفا کے یہی تو صلے

داغِ دل اپنے دیکھتا کیا ہے
تجھ کو جز داغِ دل ملا کیا ہے

اے دلِ بے خبر متاعِ حیات
دولت عشق کے سوا کیا ہے

آنسوؤ! تم زبان بن جانا
جب وہ پوچھیں کہ ''مدّعا کیا ہے

وہ مجھے بے وفا سمجھتے ہیں
''جو نہیں جانتے وفا کیا ہے''

وہ اگر مثلِ آفتاب نہیں
اُن کے عارض کی یہ ضیا کیا ہے

سرخیٔ خون اہلِ دل کے سوا
کفِ خوباں پہ یہ حنا کیا ہے

چھپ کے تنقید میرے شعروں پر
اور محفل میں 'مرحبا' کیا ہے

یہ حقائق کا دور ہے، سن لو
داستانوں میں اب دھرا کیا ہے

دوڑے آتے ہیں لوگ محفل میں
آج شاہیںؔ غزل سرا کیا ہے

❁

مجھے پھر یاد اپنے عشق کا انجام آتا ہے
رہِ الفت میں کب کوئی کسی کے کام آتا ہے

کہاں تک آزمائش، دل نہ توڑ اے سنگ دل اُس کا
جگر تھامے تری محفل میں اِک ناکام آتا ہے

وہ مجھ سے کب ملے، لیکن زمانے کا ستم دیکھو!
جب اُن کا ذکر چھڑتا ہے تو میرا نام آتا ہے

چمک اُٹھیں مری بے نور آنکھیں، اے اجل رُک جا
وہ لے کے نامہ بر اُن کا کوئی پیغام آتا ہے

خدا کے واسطے ٹھہرو، کہاں جلدی ہے جانے کی
تمھیں پا کر دلِ مضطر کو کچھ آرام آتا ہے

بہت رسوا ہوئے ہم آج اُن کی بزم میں آ کر
نہ کوئی بات کرتا ہے نہ ہم تک جام آتا ہے

جو غیرت مند ہے، آگے کسی کے جھک نہیں سکتا
ہوس کا ہے جو بندہ بس وہ زیرِ دام آتا ہے

نہ کوئی رابطہ اُس سے، نہ کوئی واسطہ اُس سے
خیال اُس کا مجھے کیوں اتنا صبح و شام آتا ہے

وہ خود دل توڑتے ہیں کر کے پیمانِ وفا یارب!
یہ آخر مفت کا شاہیںؔ پہ کیوں الزام آتا ہے

٭

ٹوٹی کشتی، بپھری موجیں، سختیٔ طوفاں بھی ہے
ہے خدا پیشِ نظر، مشکل مری آساں بھی ہے

ظرف اپنا رکھ بلند اور محفلِ رنداں میں آ
مے بھی ہے، ساقی بھی ہے اور جشن کا ساماں بھی ہے

انقلاب آ جائے گا جس کی بدولت دوستو!
ہے یقیں ہم کو، ہمارے پاس وہ ساماں بھی ہے

ہر تمنّا، ہر خوشی کو دے کے مایوسی کا رنگ
ہم سمجھ بیٹھے کہ عالم محفلِ گریاں بھی ہے

آتشِ نمرود گو لَو دے رہی ہے اِک طرف
میری نظروں میں مگر وہ گلشنِ خنداں بھی ہے

جستجو ہے میری فطرت، آرزو میرا شِعار
اپنی نظروں میں جہانِ نو ابھی پنہاں بھی ہے

خود نگاہیں ڈھونڈ لیں گی، لاکھ پردے میں رہے
چشمِ بینا کے لیے رازِ جہاں عریاں بھی ہے

راز اِس میں کیا ہے شاہیںؔ، مردِ مومن سے یہ پوچھ
موجِ خوں سے کھیلنا مشکل تو ہے، آساں بھی ہے

❁

اب کہاں جاؤں میں اُٹھ کر تیرے کاشانے کے بعد
سوچتا ہوں بس یہی اب ہوش میں آنے کے بعد

’چھوڑ کر اِس شہر کو جانا ترا ممکن نہیں‘
اِک صدا آتی ہے اکثر رات ڈھل جانے کے بعد

جانے والا شہر کی رعنائیاں بھی لے گیا
شہر کیا سُونا پڑا ہے آج دیوانے کے بعد

خیر و شر کا تجزیہ ہی ہے اساسِ زندگی
آدمی بنتا ہے انساں یہ سمجھ جانے کے بعد

چھیڑ دیوانے سے یہ اچھی نہیں ہے ناصحا!
اور بھی الجھے گا ناداں تیرے سمجھانے کے بعد

کلفت و آلام کے سب نقش مٹ جاتے ہیں دوست!
کیا سکوں ملتا ہے دل کو تیرے آ جانے کے بعد

خوب تُو جی بھر کے رو لے اپنی بربادی پہ آج
سیلِ غم تھم جائے گا کچھ اشک بہہ جانے کے بعد

قرب جب حاصل ہوا اُس کا تو یہ عقدہ کھلا
خود کو کھو بیٹھے ہیں شاہینؔ اُس کو پا جانے کے بعد

❀

تصوّر نے مجھے سپنے دکھائے، تم نہیں آئے
تمھاری یاد کے دیپک جلائے، تم نہیں آئے

شبِ مہتاب کی رعنائیاں رخصت ہوئیں آخر
کئی تارے سرِ مژگاں تک آئے، تم نہیں آئے

مری محرومیاں آئیں ہزاروں رنج و غم لے کر
نہ آنا تھا جنھیں اے دوست، آئے، تم نہیں آئے

غضب کی رات تھی وہ انتظارِ یار کی شب تھی
بہت لمحوں کے نشتر میں نے کھائے، تم نہیں آئے

ہزاروں وسوسے، احساسِ تنہائی رہا شب بھر
جگر خوں ہو گیا، اے دوست ہائے، تم نہیں آئے

تسلّی دی ترے بیمار کو غیروں نے بھی آ کر
مری قسمت نے یہ دن بھی دکھائے، تم نہیں آئے

(لذرِ غالب)

عشوہ، غمزہ اور اشارا چاہیے
دوست اِک ہنگامہ آرا چاہیے

بھا گئی ہے دل کو جو شکلِ حسیں
اُس کو شیشے میں اُتارا چاہیے

جان دے دینی تو کچھ مشکل نہیں
ایک ہلکا سا اشارا چاہیے

شہر میں اب دل مرا لگتا نہیں
مجھ کو قدرت کا نظارا چاہیے

لمحہ لمحہ غم عطا ہوتا رہے
کچھ تو جینے کا سہارا چاہیے

اپنی محفل میں بلاؤ پھر مجھے
یہ کرم مجھ پر دوبارا چاہیے

اچّھی سیرت پر نہیں اُن کی نظر
کہتے ہیں جو 'ماہ پارا چاہیے'

جو ترے فن کا حوالہ بن سکے
نقش اِک ایسا اُبھارا چاہیے

ملتمس ہے تجھ سے اب شاہیںؔ بھی
لطف اِس پر بھی خدارا چاہیے

ڈالی ہے دل میں عشق نے ایثار کی طرح
ملتے رہیں گے اُس سے پرستار کی طرح

کیسے نباہ ہو گا، خدارا جواب دے!
ہر بات تیری لگتی ہے تلوار کی طرح

ہے مصلحت اِسی میں، سمجھتے رہیں یہی
'ہاں' بھی تو اُس کی ہوتی ہے انکار کی طرح

کچھ تو کہو زباں سے کہ احساسِ قرب ہو
تم تو خموش بیٹھے ہو دیوار کی طرح

سوچا تھا آج 'ہاں' میں ملے گا کوئی جواب
انکار پھر وہ کر گئے ہر بار کی طرح

ہیں اور غم زمانے میں، یہ مانتا ہوں میں
ہر غم مگر کہاں ہے غمِ یار کی طرح

وہ چاہتے ہیں جاننا گر میرے دل کا حال
پڑھ لیں، کھلا ہوا ہوں میں اخبار کی طرح

شاید کسی حسیں کی نظر لگ گئی تمھیں
شاہیںؔ نظر جو آتے ہو بیمار کی طرح

نغمہ کہیں، رباب کہیں، شاعری کہیں
مجھ سے بچھڑ گئی ہے میری زندگی کہیں

میں خود ہی جل رہا ہوں، مجھے اور مت جلا
اے چاند، لے جا آگ سی یہ چاندنی کہیں

کچھ اور عزم تجھ کو مہینوالؔ چاہیے
مل جائے گی ضرور تجھے سوہنیؔ کہیں

اِک عمر کی وفا کا صلہ مجھ کو مل گیا
دل خوں ہوا تو مجھ کو ملی ہے خوشی کہیں

پہلا سا التفات، نہ پہلی سی وہ نظر
کیا چاہتوں میں آ گئی اپنی کمی کہیں

سینے میں درد کی جو یہ لہریں ہیں موج زن
دل میں چبھی ہے اُس کی نگہ کی اَنی کہیں

پتھر میں حسن ہے، مگر فن کار چاہیے
پنہاں اِسی میں شکل ہے من موہنی کہیں

❀

نہ مہوشوں کی طرح ہے، نہ گُل رُخوں کی طرح
کسی کی یاد مسلسل ہے الجھنوں کی طرح

سلوکِ زہرہ وشاں بھی عجب معمّا ہے
جو دوستوں کی طرح ہے، نہ دشمنوں کی طرح

حذر حذر کہ ہواؤں سے گیسوؤں کی لٹیں
جبینِ صاف پہ رقصاں ہیں ناگنوں کی طرح

خیالِ عشرتِ منزل نہ کر خدا کے لیے
سلوکِ راہ براں بھی ہے رہزنوں کی طرح

خلوصِ اہلِ جنوں ہے نہ مہرِ اہلِ خرد
مری حیات ہے گردش میں بے کسوں کی طرح

تمھیں ہو میری محبت کی کائنات، تمھیں!
ملا کرو نہ کبھی مجھ سے بدظنوں کی طرح

بے وفا سے بھی وفا کی داد پانے کے لیے
جا رہا ہوں زخم ہائے دل دِکھانے کے لیے

جس سے وابستہ کہانی تھی، وہ رخصت ہو گیا
درد کی ہے داستاں باقی سنانے کے لیے

رنگ، خوش بُو، چاندنی سے اُس کا دامن بھر دیا
وقت نے ہم کو چنا بس آزمانے کے لیے

ہر نئے سورج کی پوجا ہے دلیلِ کافری
وقف ہے اپنی جبیں اِک آستانے کے لیے

بے نیازی میں نہاں ہے اپنی آزادی یہاں
فکر اب کرتا نہیں میں آشیانے کے لیے

طعن و تشنہ، طنز و نشتر، رنج و غم، بربادیاں
ارمغاں کیا کیا یہاں ہیں اِک دیوانے کے لیے

لوٹ کر آئے گا وہ، دل کی کشش ہے وہ کشش
شرط یہ ہے گر نہ جاؤ تم منانے کے لیے

تذکرہ اُس سے کیا ملنے کا، تو ہنس کر کہا
ہم ملے تھے تم سے، لیکن بھول جانے کے لیے

تم کبھی ہنس بول کر شاہیںؔ کا دل بھی خوش کرو
بات جب کرتے ہو بس دل کو جلانے کے لیے

❁

رک جاؤ تھوڑی دیر کو، جلدی ہے کیا پڑی
کیوں بار بار دیکھتے ہو دوست تم گھڑی

اُن کا خیال زیست کا عنواں بنا رہا
اپنا خیال تو مجھے آیا نہیں کبھی

اِک حادثے نے فاصلہ وہ ختم کر دیا
حائل جو درمیاں تھی وہ دیوار گر پڑی

وہ مجھ کو جانتی تھی کہ نظروں کا تھا فریب
کل دیر تک وہ مجھ کو کھڑی دیکھتی رہی

میرے سوال کا نہ ملا گو کوئی جواب
تحریر جو جبین پہ اُبھری تھی، وہ پڑھی

گم صم اُداس رہتے ہو شاہینؔ کس لیے
کچھ تو بتاؤ، کون سی اُفتاد آ پڑی

کسی کو داغ اپنے دل کے دکھلانے نہیں جاتے
کسی سے داد اپنے زخم کی پانے نہیں جاتے

بہت ہے دل کشی، اِس شہر میں یہ مانتے ہیں ہم
ہماری یاد سے لیکن وہ ویرانے نہیں جاتے

دِوانے مر کے بھی رہتے ہیں زندہ اِس طرح، دیکھو
جو وابستہ ہوئے اُن سے، وہ افسانے نہیں جاتے

بہت سمجھایا واعظ کو، مگر سمجھا نہیں ناداں
کہ عاجز آ گئے، اب اُس کو سمجھانے نہیں جاتے

تمھیں دولت ملی تو اِس قدر بدلے کہ اے شاہیںؔ
کسی صورت سے اب اے دوست پہچانے نہیں جاتے

❁

بجھنے سے پہلے میں نے جلائے کئی چراغ
جاری ہے روشنی کا سفر میرے بعد بھی

❁

خواہشوں کی بھیڑ میں گزری ہے اپنی زندگی
ہم چراغِ آرزو تھے، عمر بھر جلتے رہے

❁

یا توڑ دے قفس کو، یا جان سے گزر جا
مجبور ہو کے جینا توہینِ زندگی ہے

٭

تم سے تو، میرے دوست، عجب دوستی رہی
لطف و کرم رہا تو کبھی برہمی رہی

آنے کو انقلاب تو آئے کئی مگر
اپنا جو آگے حال تھا، حالت وہی رہی

مل جائے گی ملازمت اب کے برس ضرور
ہر سال میری اہلیہ سنتی یہی رہی

بازار 'لائٹ ہاؤس' کے، ہر سال کی طرح
اِک کوٹ میرے واسطے وہ ڈھونڈتی رہی

اپنا خیال بھی مجھے اُس وقت آ گیا
وہ غور سے جو مجھ کو بہت دیکھتی رہی

طوفانِ غم سے کھیلتے آگے نکل گئے
اپنی شکستگی سے بھی دل بستگی رہی

آئیں گھٹائیں جھوم کے، لیکن گزر گئیں
دہقان کی نگاہ اُنھیں دیکھتی رہی

ہونٹوں پہ میرے لاکھ رہی خامشی مگر
شعر و سخن کی بزم تو مجھ سے سجی رہی

رقم جب وفا کی حکایت کرے ہے
مرا ذکر بھی وہ نہایت کرے ہے

وہ شرحِ تمنّا پہ ہوتے ہیں برہم
یہ دل پھر بھی ایسی جسارت کرے ہے

جو حامی تھا مظلوم کا سب سے بڑھ کر
وہی ظالموں کی حمایت کرے ہے

گریزاں جو سائے سے بھی تھا ہمارے
کرم آج ہم پہ نہایت کرے ہے

مخالف جو تھے، ہم نوا بن رہے ہیں
عجب دل نشیں وہ خطابت کرے ہے

نہیں دیکھتا جو گریبان اپنا
وہی دوسروں کو ملامت کرے ہے

ہماری وفا کا جو قائل بہت تھا
وہی اب وفا کی شکایت کرے ہے

زمیں پر نہیں جس کی بنیاد کوئی
وہ تعمیر ایسی عمارت کرے ہے

نہیں بانٹتا دکھ کبھو وہ کسو کا
تو کاہے کو شاہیںؔ شکایت کرے ہے

❁

رُک گئے ہیں آپ یوں آ کر مری محفل کے پاس
جس طرح کوئی ہو دریا سے الگ ساحل کے پاس

اِس سفر میں رہنمائی کی مجھے حاجت نہیں
رہبروں ہی نے مجھے بھٹکایا ہے منزل کے پاس

میں نے جب چاہا، سمندر سے لیا موتی نکال
سیپیاں چنتے رہے تم تو فقط ساحل کے پاس

ہم کہ نادانی میں جس کو ہر جگہ ڈھونڈا کیے
کیا خبر تھی یہ کہ رہتا ہے ہمارے دل کے پاس

کٹ گئی گردن تڑپ باقی ہے پھر بھی جسم میں
کہہ گئے یہ بات جب آئے تھے وہ بسمل کے پاس

اُس کی محفل سے اُٹھا جب، شادماں تھا میں بہت
اِک خلش محسوس کرتا ہوں مگر اب دل کے پاس

قتل کر کے سرخ رُوئی بھی وہ شاہیں بخش دے
حوصلہ اِتنا کہاں ہے اب مرے قاتل کے پاس

❁

اگرچہ چرخ پہ سورج بھی، ماہتاب بھی ہے
کسی کے حُسن کا شاہیںؔ کوئی جواب بھی ہے!

تری نظر کو کرم آشنا ہمیں نے کیا
تری نظر کا ہمیں پر مگر عتاب بھی ہے

سوالِ دید پہ تازہ گلاب بھیج دیا
کہا سوال کا تیرے یہی جواب بھی ہے

خوشی کا نام ہے یہ زندگی کسی کے لیے
کسی کے واسطے یہ زندگی عذاب بھی ہے

حسین اور بھی دیکھے بہت زمانے میں
ترا شباب مگر حاصلِ شباب بھی ہے

حقیقت آپ سمجھتے ہیں جس کو اے شاہیںؔ
کبھی جو غور سے دیکھیں تو ایک خواب بھی ہے

جہاں وسعتِ آگہی کا سماں ہے
نہ تنگی زمیں کی، نہ تنگ آسماں ہے

مرے عزم نے بال و پر مجھ کو بخشے
کہ اب دست رَس میں مہ و کہکشاں ہے

وہ ماضی کے بستر پہ سویا ہوا ہے
بدن اُس کا بوسیدہ سا اِک مکاں ہے

اُسے کس طرح اب سکوں مل سکے گا
کہ جس کے لیے مضطرب اِک جہاں ہے

گریزاں ہیں اپنوں ہی سے آج اپنے
عجب ہے یہ منظر، عجب یہ سماں ہے

پڑوسی ترے دھوپ کو ہیں ترستے
بہت تُو نے اونچا بنایا مکاں ہے

وہی میرا ہم راز تھا، ہم زباں تھا
خدا جانے کس حال میں ہے، کہاں ہے

چلو تم بھی شاہیںؔ اُسی انجمن میں
اساسِ محبت جہاں حکم راں ہے

کہاں اب وہ خلوصِ بندگی ہے
محبت کھیل ہے، اِک دل لگی ہے

زمانے کے کہاں تیور ہیں ایسے
مزاجِ یار میں جو برہمی ہے

تمھیں میں بھول جاؤں دوست کیسے
تمھاری یاد میری زندگی ہے

کہاں ہے چاہنے والا قمر کا
کہ جس کا شعر خود ہی چاندنی ہے

بصیرت چھین لی تہذیبِ نو نے
عجب یہ روشنی بھی روشنی ہے

خوشی کا دور بھی آئے گا لیکن
مصیبت اور بھی کچھ جھیلنی ہے

خزاں کے دن بھی ہیں مجھ کو گوارا
بہارِ زندگی بھی دیکھنی ہے

ہمارا رنگ ہے شاہیںؔ اچھوتا
ہماری فکر میں اِک تازگی ہے

اُٹھ کر حریمِ ناز سے تنہا نہ آئیے
کچھ پرتوِ جمال بھی ساتھ اپنے لائیے

اوروں کا ظرف دیکھیے، لیکن یہ شرط ہے
کیا پاس آپ کے ہے، ذرا دیکھ ڈالیے

جن کا جواب بن نہ پڑے آپ سے کبھی
کیوں کر رہے ہیں ایسے مرتّب سوالیے

شہروں کی روشنی سے تو بنتی نہیں ہے بات
تاریک اپنے گاؤں ہیں، اُن کو اُجالیے

الفاظ کے برتنے کا فن سیکھیے جناب
بیٹھے ہیں آپ توڑنے دانتوں سے چھالیے

شرفِ قبولیت جو ملے، بات ہے بڑی
مت روگ اپنے ساتھ یہ شہرت کا پالیے

شاہیںؔ جا کہو یہ مدیرانِ شہر سے
میں اہلِ فن ہوں، میرا بھی نمبر نکالیے

داغ اپنے دل کے سارے ڈھل گئے
سُن کے میرا حال جب وہ رو دیے

جل رہے ہیں دید کی حسرت لیے
کر گئے تھے آپ جو روشن دیے

جرأتِ گفتار مجھ میں تھی نہیں
ہونٹ اپنے میں نے آخر سی لیے

ہاں وہ لمحے ہیں ہماری زندگی میں
جو تمھارے قرب سے حاصل کیے

دشمنوں پر پیار اب آنے لگا
دوستوں نے اِس قدر چرکے دیے

کر رہا ہوں بارہا خود سے سوال
جی رہا ہوں آج تک کس کے لیے؟

یہ خموشی تو قیامت بن گئی
بولیے سرکار، کچھ تو بولیے

فکر رونے کی ہمارے کیوں کریں
سوکھ ہی جاتے ہیں بھیگے تولیے

❀

آئینہ تو سب نے توڑا!
دلِ شکستہ کس نے جوڑا!

وہ سمجھتے ہیں زیادہ
آپ سمجھاتے ہیں تھوڑا!

اُڑ رہی ہے گرد کتنی
اور مت دوڑاؤ گھوڑا!

خود گرو گے کھا کے ٹھوکر
راہ میں پھینکو نہ روڑا!

غیر کو اپنا سمجھ کر
تم نے میرا ساتھ چھوڑا

آؤ لگ جاؤ گلے سے
اے مرے ڈھاکا، اکھوڑا *

تھا بڑا منکر وفا کا
میں نے بھی سمجھا کے چھوڑا

* سابقہ مشرقی پاکستان کا مشہور جنکشن

پڑھتا تھا رات دن جنھیں، چہرے وہ ہٹ گئے
جو نقش دیدنی تھے وہ کرنوں میں بٹ گئے

دیوار سامنے جو تھی، آندھی میں گر پڑی
پتھر جو راستے کے تھے، سارے وہ ہٹ گئے

اِتنا بڑا مکان ہے، رہتا نہیں کوئی
دیوار و در سے آ کے پرندے چمٹ گئے

کچھ لوگ اپنی ذات میں اِک انجمن بنے
کچھ لوگ اپنے خول کے اندر سمٹ گئے

صحرانورد، لوٹ بھی آ اپنے شہر میں
گرد و غبار سے ترے ملبوس اَٹ گئے

تحصیلِ علم ہو نہ ہو، مل تو گئی سند
توتے کی طرح سارے ہم اسباق رٹ گئے

شاہیںؔ کیسی چل گئی تفریق کی ہوا
انسان آج کتنے قبیلوں میں بٹ گئے

محبت میں ستم کاری سے بچیے
وفا کیجیے، دل آزاری سے بچیے

یہ کیسا فرق ہے قول و عمل میں
صداکاری، اداکاری سے بچیے

جو خواہش ہے سکوں کی، گھر میں رہیے
ہجومِ گرم بازاری سے بچیے

رسد پر فرق پڑتا ہے طلب سے
بہت لمبی خریداری سے بچیے

نہ ہو پوشیدہ کوئی چال اِس میں
سنبھلیے، ایسی دل داری سے بچیے

فریبِ دل رُبا سے ڈرتے رہیے
گلوں کی شعبدہ کاری سے بچیے

جدا شاہینؔ ہو مسلک سخن میں
روایت کی پرستاری سے بچیے

یاد آئے وہ، روز و شب آئے
فاصلے زخم کو نہ بھر پائے

وہ سفر زیست کا تھا سرمایہ
آج بھی یاد اُس کی تڑپائے

وہ دیارِ حسیں، حسیں منظر
یعنی قلب و نظر کے سرمائے

روپ دہکے ہوئے حسینوں کے
شہرِ خوباں نے کیا ستم ڈھائے

ہر قدم پر تھے سیکڑوں جلوے
ہر قدم پر حیاتِ نو پائے

ایسا لگتا ہے، خواب دیکھا تھا
رُت حسیں، وہ حسین ہمسائے

پردۂ ذہن پر اُبھرتے ہیں
جتنے منظر نظر نے فلمائے

روپ اُس کا نظر میں ہے اب یوں
عکس ٹی وی میں جیسے در آئے

کوئی اپنا یہاں نہ بیگانہ
ہم کہاں سے کہاں چلے آئے

اُن کو پایا بھی، اُن کو کھویا بھی
وہ تصوّر میں بار بار آئے

کوئی شاہیںؔ کو اتنا بتلا دے
اُٹھ کے اُس در سے اب کہاں جائے

❀

رہنما زردار ناداروں کے بیچ
ہے عجب کردار کرداروں کے بیچ

عاشقوں کا یہ بھی ہے ادنیٰ کمال
کھیلتے رہتے ہیں انگاروں کے بیچ

نام لیتے تھے فقط اللہ کا
حق ادا کرتے تھے تلواروں کے بیچ

اگلی ساری صورتیں گم ہو گئیں
شکل دیکھی ایسی دیواروں کے بیچ

مصلحت کے ہو گئے تھے سب شکار
بولتا تھا میں ہی سرداروں کے بیچ

زندگی کا تھا نیا اِک تجربہ
وقت گزرا جو بھی بنجاروں کے بیچ

سربریدہ تھا صفِ اعدا میں کون
گُل کھلائے کس نے یوں خاروں کے بیچ

آسرا ہے چار یاروں کا مجھے
میں ہوں محتاجِ کرم چاروں کے بیچ

تکتے ہی رہتے ہو شاہیںؔ اُس طرف
کیا نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

تمھاری یاد میں گر زندگی اپنی بسر ہوتی
بہت ہی سودمند ہوتی، نہایت معتبر ہوتی

ہمارے حال پہ اے کاش گر اُس کی نظر ہوتی
نہ ہم نالہ بلب ہوتے، نہ یہ آہِ سحر ہوتی

ارے او بے خبر، تجھ کو اگر کچھ بھی خبر ہوتی
تو میرے دل کی دنیا یوں نہ پھر زیر و زبر ہوتی

کسی کے کام آ جاتے! کوئی تو کام کر جاتے!
بلا سے زندگی اپنی نہایت مختصر ہوتی

گئے دل میں لیے حسرت شبِ ظلمت کے زندانی
یہ روشن بام و در ہوتے، ہماری بھی سحر ہوتی

رضا پر ہم تری مرتے، رضا ہی پر تری جیتے
اِسی خواہش پہ اپنی زندگی بس منحصر ہوتی

غزل کہتے تو ہو شاہیںؔ، غزل پڑھنی نہیں آتی
ترنّم سے اگر پڑھتے، غزل پھر معتبر ہوتی

میں جو خود سے ملا تو خدا مل گیا
آگہی کا یہ مجھ کو صلہ مل گیا

چل پڑے سُوئے منزل تو یوں بھی ہوا
پاؤں اٹھتے گئے، راستہ مل گیا

اس کی قربت مجھے راس آتی گئی
کامرانی کا اِک سلسلہ مل گیا

اُس کی بخشش پہ سو ناز مجھ کو بھی ہیں
جو بھی مانگا تھا، اُس سے سوا مل گیا

اُس دریچے میں ہے رنگ و آواز بھی
وہ دریچہ جو اِک دن کھلا مل گیا

'ہائے، کس کی نظر لگ گئی شہر کو'
ایک بوڑھا یہ کہتا ہوا مل گیا

کچھ مکاں جل گئے، کچھ مکیں جل مرے
کھیل کیسا تھا یہ، کس کو کیا مل گیا

میرا رہبر گیا جس جگہ چھوڑ کر
بس وہیں سے مجھے راستہ مل گیا

لاش دریا سے نکلی تھی عورت کی جب
ایک بچّہ بھی لپٹا ہوا مل گیا

اپنے اشعار پڑھتے اُنھیں سن لیا
شعرگوئی کا شاہیںؔ صلہ مل گیا

خود کو خوں میں ڈبو کے آئے ہیں
سرخ رُو یوں بھی ہو کے آئے ہیں

اپنا آنگن بھرا تھا بچّوں سے
حیف اُن سب کو کھو کے آئے ہیں

اِک قیامت گزر گئی ہم پر
اِک قیامت سے ہو کے آئے ہیں

سمجھو کم تر ہمیں نہ اے لوگو!
تھا بہت کچھ جو کھو کے آئے ہیں

گرد صدیوں سے تھی جو چہرے پر
خون سے اپنے دھو کے آئے ہیں

اُس زمیں پر جو ہم نے چھوڑی ہے
بیج الفت کے بو کے آئے ہیں

کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں شاہیںؔ
جانے کیا چیز کھو کے آئے ہیں

آشاؤں کے دیپ جلا، کیوں نین سے جل چھلکاتا ہے
سب ہیں اپنے اپنے دکھ میں، کون مدد کو آتا ہے

چٹھی تھی اِک آنے والی، آس لگائے بیٹھا ہوں
خط تو ویسے نامہ بر، ہر روز مجھے دے جاتا ہے

ٹوٹ گیا وہ رشتہ دل کا، آنا جانا ختم ہوا
چھت پر میرے بیٹھا کاگا کاہے شور مچاتا ہے

نکل تو آئی گِدھ شالے سے، انسانوں کی بستی میں
کون اِسے اپنائے، دیکھیں، کون اسے ٹھکراتا ہے

بات بگڑ جائے گی یا پھر بات کوئی بن جائے گی
کون کسی کے گھر پہ ورنہ ایسے آتا جاتا ہے

جس کی خاطر روگ لگائے، چین بھی کھویا، نیند گنوائی
آج وہی ان جان بنا ہے، آج وہی ٹھکراتا ہے

سمے سمے کی بات ہے پیارے، سمے سمے کا پھیرا ہے
بات نہیں سہہ سکتا تھا جو آنسو بھی پی جاتا ہے

کر کے کوئی کام دکھائے تو میں گیانی مان بھی لوں
گیان کا اپنے یوں تو شاہینؔ اکثر دھونس جماتا ہے

دُکھ کا لاکھ اندھیرا ہو گا
سکھ کا ساتھ سویرا ہو گا

پیڑ ہیں سارے سہمے سہمے
جن یا بھوت کا ڈیرا ہو گا

بات سمجھ میں کچھ نہیں آئی
سوچ سمجھ کا پھیرا ہو گا

کتنی روشن ہیں یہ گلیاں
اُس کا یہیں بسیرا ہو گا

چاندنی شب کا لطف اُٹھاؤ
پھر تو گھور اندھیرا ہو گا

آج بہت غمگیں تھا شاہیںؔ
آشاؤں نے گھیرا ہو گا

❀

اُس کو آخر خراب ہونا تھا
اِک فسانے کا باب ہونا تھا

سچ کی خوش بُو نہ پھیلتی کب تک
جھوٹ کو بے نقاب ہونا تھا

روز اِک خواب دیکھنے والے
تجھ کو آزردہ خواب ہونا تھا

وہ ستارہ صفت تھا بچپن میں
ہاں اُسے آفتاب ہونا تھا

کاش پہلے ہی وہ سمجھ لیتا
آخرش احتساب ہونا تھا

حوصلے بڑھ گئے تھے مشکل میں
مجھ کو تو کام یاب ہونا تھا

رنگ و بُو قید میں رہے کب تک
اُس کلی کو گلاب ہونا تھا

پاپ کی ناو کب تلک چلتی
ایک دن غرقِ آب ہونا تھا

شعر شاہیںؔ کے بھی ہیں کچھ ایسے
جن کو جزوِ نصاب ہونا تھا

گرچہ مشکل ہے راستی کا سفر
مجھ سے ہوگا نہ واپسی کا سفر

تم دیے سے دیا جلا لینا
رکنے پائے نہ روشنی کا سفر

میرے بچّے میرا تسلسل ہیں
یوں بھی جاری ہے زندگی کا سفر

چَھپ رہے ہیں بہت سفرنامے
معتبر ہے کسی کسی کا سفر

ایک عالم سے مل کے آیا ہوں
کر کے آیا ہوں اک صدی کا سفر

علم و عرفاں کی ہے طلب جب تک
ختم ہوگا نہ آگہی کا سفر

ساتھ اُن کا ہے، چاندنی شب ہے
ہے حسیں کتنا یہ ندی کا سفر

ہو کے مجبور گھر سے نکلے تھے
یاد آتا ہے بے بسی کا سفر

کیا قیامت ہیں آخری لمحے
سخت مشکل ہے جان کنی کا سفر

تم بھی شاہیں مقام پا لو گے
جاری رکھو یہ شاعری کا سفر

کتابِ زندگانی لکھ رہا ہوں
محبت کی کہانی لکھ رہا ہوں

بھٹکنا در بدر اپنا مقدّر
ملی ہے جو نشانی لکھ رہا ہوں

حقیقت لکھ رہا ہوں میں سراسر
وہ یہ سمجھے کہانی لکھ رہا ہوں

جلا کر میں چراغِ عہدِ رفتہ
وہی خوابِ جوانی لکھ رہا ہوں

بھلا کر زرد موسم کی حکایت
نئی رُت کی کہانی لکھ رہا ہوں

محبت جس کا بھی مسلک رہا ہے
اُسے میں 'غیرفانی' لکھ رہا ہوں

تباہی کا کروں میں کس سے شکوہ
تمھاری مہربانی لکھ رہا ہوں

ہے شاہیںؔ شعر میں پرتو اُسی کا
اُسی کی گل فشانی لکھ رہا ہوں

ہستی کو آوارہ لکھ!
بستی کو سیّارہ لکھ!

ہر پل ہے تُو گردش میں
خود کو اِک بنجارہ لکھ!

ناچے جو شعلوں کے سنگ
اُس کو 'اگنی دھارا' لکھ!

خود بھی تُو یوسف کہلا
اُس کو بھی مہ پارہ لکھ!

اپنی گر توصیفیں سن
اُس کو بھی شہ پارہ لکھ!

چٹّھی گُم ہو سکتی ہے
خط اُس کو دوبارہ لکھ!

جب اُس کا شیدائی ہے
دل کو پارہ پارہ لکھ!

شاہیںؔ جو بھی کہتا ہے
اُس کو حق کا نعرہ لکھ!

❁

اِسی حسرت میں ہم تو زندگی کے دن گزار آئے
بہار آئے نگار آئے، نگار آئے قرار آئے

لٹا بیٹھے تری چاہت میں، جو کچھ پاس تھا اپنے
جو نقدِ جاں بچی تھی اِک، اُسے بھی تجھ پہ وار آئے

ہوئے برباد، لیکن ہے خوشی اِس بات کی ہم کو
کہ اِتنا ہو سکا ہم سے، ترے گیسو سنوار آئے

جسے میں بھولنا چاہوں، بھلانا ہے عجب مشکل
خیالوں میں وہی اِک شخص میرے بار بار آئے

کمی ہے درد میں کچھ کچھ، مرض میں بھی افاقہ ہے
بہت مشکور ہوں اُن کا، جو میرے غم گسار آئے

وفا ناآشنا ہے وہ، کجی ہے اُس کی فطرت میں
مگر اپنی یہ مجبوری، اُسی ظالم پہ پیار آئے

تمھیں سے ہے بہارِ گلستاں آؤ، چلے آؤ
چمن رنگین ہو جائے، ہوائے مشک بار آئے

انھیں کو زندگی کا اپنے سرمایہ سمجھتے ہیں
جو اُس کوچے میں اے شاہیںؔ کچھ لمحے گزار آئے

❁

تم کو مرا اندازِ سفر راس نہ آیا
اب ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ

اُس نے تو مرا حوصلہ کچھ اور بڑھایا
مجھ کو غمِ حالات نے جتنا بھی ستایا

وہ زیست کے میلے میں، جدا ہو گیا مجھ سے
ڈھونڈا اُسے تا عمر، مگر ہاتھ نہ آیا

ہم اہلِ وفا جیتے ہیں، کس شان سے دیکھو
شاہیںؔ تمھیں جینے کا یہ انداز نہ آیا

ہم ہار کے بھی جیت گئے عشق کی بازی
یہ کھیل ہی ایسا ہے، سمجھ میں نہیں آیا

لوگوں کو بہت لوٹ کے دولت تھی کمائی
چوروں نے کیا آج مرے گھر کا صفایا

غربت کی فضا راس جو اِک شخص کو آئی
نکلا جو سفر پر تو نہیں لوٹ کے آیا

جل جاؤ کڑی دھوپ میں شاہینؔ مگر تم
اپنوں سے نہ مانگو کبھی دیوار کا سایہ

❁

جب تمیزِ آدمیت کا ہنر آ جائے گا
کون اچھا ہے، برا ہے، سب نظر آ جائے گا

کوئی بھی منزل ہماری آخری منزل نہیں
ختم ہو گا اِک سفر تو پھر سفر آ جائے گا

اِک ذرا سا حوصلہ، اُمّید کا دامن نہ چھوڑ
وہ سکونِ جسم و جاں اے چشمِ تر آ جائے گا

ہم نے بارش کی دُعا مانگی تھی، پر اِتنی نہیں
کیا خبر تھی سیل میں سارا نگر آ جائے گا

اہلِ دنیا اِس قدر بھی خودغرض ہو جائیں گے
اپنے ہی دامِ ہوس میں ہر بشر آ جائے گا

پوچھتا کوئی نہیں، ہے جو شجر بے برگ و بار
اُس کی بھی توقیر ہوگی جب ثمر آ جائے گا

ناز مجھ کو بھی ہے اپنے جذبۂ دل پر بہت
روٹھ کر جاتا ہے مجھ سے وہ، مگر آ جائے گا

میؔر کو، غالبؔ کو پڑھ! اقبالؔ، بیدلؔ، شاؔد کو
شعرگوئی کا تجھے شاہیںؔ ہنر آ جائے گا

مجھے تو یہ جہاں اچّھا لگا ہے
فلک کا سائباں اچّھا لگا ہے

کشاکش درمیاں پیہم ہے جاری
حقیقت سے گماں اچّھا لگا ہے

تُو مل مجھ سے ذرا وقفے سے لیکن
ترا حسنِ بیاں اچّھا لگا ہے

رسائی ہے مری ہر آستاں تک
مگر اک آستاں اچّھا لگا ہے

جہاں پر رنگ آمیزی ہوئی ہے
وہ جزوِ داستاں اچّھا لگا ہے

بہت سرو و سمن گلشن میں دیکھے
وہی سروِ رواں اچّھا لگا ہے

یہ دُنیا راس کب آتی مجھے بھی
ترے دم سے جہاں اچّھا لگا ہے

ضرورت بھی مکینوں کی رہی ہے
کبھی خالی مکاں اچّھا لگا ہے!

بوقتِ شام گاؤں میں گھروں سے
مجھے اُٹھتا دھواں اچّھا لگا ہے

ہے اُس کی بزم میں شاہینؔ رونق
ہجومِ مہوشاں اچّھا لگا ہے

سلگتی ہے کسی کی یاد، دیکھو
یہ گھر ہونے کو ہے برباد، دیکھو

عجب اُس شوخ کا طرزِ عمل ہے
کوئی ناشاد، کوئی شاد، دیکھو

ہیں دل میں دفن کتنی آرزوئیں
اِنھیں سے گھر ہے یہ آباد، دیکھو

زمانہ بھول بیٹھا ہے تمھیں کو
تمھیں کو میں نے رکّھا یاد، دیکھو

اِسی اُمّید پہ کہتا غزل ہوں
وہ کب دیتے ہیں مجھ کو داد، دیکھو

ہوا احساس ضبطِ غم کا اُس کو
خموشی بن گئی فریاد، دیکھو

وہی درسِ وفا دیتے تھے شاہیںؔ
وہی اب کرتے ہیں بے داد، دیکھو

صرف یادوں کا اِک سلسلہ رہ گیا
اُن سے اِتنا ہی اب واسطہ رہ گیا

جاں بچے تو مکاں پھر سے تعمیر ہو
جل رہا تھا مکاں، دیکھتا رہ گیا

کوئی آیا نہیں، سب کو آواز دی
اے خدا، بس ترا آسرا رہ گیا

کیا توقّع رکھے غیر سے اب کوئی
آشنا کب یہاں آشنا رہ گیا

اُس کو کھو کر ملا مجھ کو احساس یہ
زیست میں جیسے کوئی خلا رہ گیا

گھر سے نکلو نہیں، گھر میں بیٹھے رہو
اب سکوں کا یہی راستہ رہ گیا

سانحے جانِ شاہیںؔ پہ گزرے بہت
یاد بس عشق کا حادثہ رہ گیا

غزل جب تک نہ ہم تم کو سُنائیں
غزل ہے معتبر، کیسے بتائیں!

تری تصویر کمروں میں سجائیں
تصوّر سے ترے گھر کو بسائیں

اُسے زر سے نہیں، اُلفت ہے مجھ سے
وہ کہتی ہے، قطر ہرگز نہ جائیں

بہت عرصے سے دیکھا تک نہیں ہے
ملے فرصت تو اُس کو دیکھ آئیں

جلا ڈالا مرا سامانِ ہستی
سلگتی ہیں مرے دل میں چتائیں

یہی جیون کے ہیں اب تو سہارے
رہیں زندہ ہماری کامنائیں

چلو جس راہ سے، منزل وہی ہے
وہ اِک مرکز مگر کتنی دِشائیں

الٰہی، کاش ایسا بھی کبھی ہو
میں روٹھوں اور وہ مجھ کو منائیں

سکوں اب شہر میں ممکن نہیں ہے
کریں آباد اب جا کر گپھائیں

نہیں رکھتے بھرم وعدوں کا اپنے
کہاں تک اُن کے کہنے میں ہم آئیں

بہت نازک ہیں شاہیںؔ آبگینے
فسانے غم کے ہم کس کو سنائیں

✿

میں دُور رہ کے بھی تجھ کو قریب رکھتا تھا
غزل بہانے تجھے یاد کرتا رہتا تھا

جو نکتہ چیں تھا مِرا شہر میں بڑا سب سے
وہی تو ایک مرا غم گسار لگتا تھا

چراغ بجھ سا گیا تھا مگر تھی زندہ دلی
بڑے وقار سے محفل میں جلتا رہتا تھا

مجھے بھی یاد کرے، اُس کو تھی کہاں فرصت
کسی کی یاد میں کھویا ہوا وہ رہتا تھا

وہی بنا ہے تباہی اب کا سبب مرے
فسردہ مجھ کو کبھی جو نہ دیکھ سکتا تھا

اُسے تو لوگوں نے شاہیں بنا دیا کیا کیا
جو حرف اُس نے لکھے خود نہیں سمجھتا تھا

حادثہ مجھ پہ بھی کوئی گزرا
یوں ہی چہرہ مرا نہیں اُترا

کس قدر پھوٹ کر وہ رویا تھا
شہر کا جس نے واقعہ لکھا

اِک تو سیلاب کی تباہی تھی
اُس پہ بادل بھی ٹوٹ کر برسا

تب ملی اعتبار کی منزل
اُس نے پہلے مجھے بہت پرکھا

ایک کُرتے کا وہ سوالی تھا
تھا مرے پاس ایک ہی کُرتا

تھا میں شہرت کا بھی تمنائی
مجھ کو بدنامیوں کا بھی ڈر تھا

کیسی محفل میں مچ گئی ہل چل
نام میرا کسی نے جب پوچھا

اب تو بچّوں کے ہاتھ میں شاہیں
اِک کھلونا ہے اسلحہ گویا

❀

دل ہے زندہ، نہ جان باقی ہے
ایک خالی مکان باقی ہے

اِس خرابے میں بھی غنیمت ہے
ہے بھرم، کچھ تو آن باقی ہے

ہے یہی فکر، سب یہ کہتے ہیں
جان ہے تو جہان باقی ہے

اپنی عظمت تو کھو چکے کب کے
عظمتوں کا نشان باقی ہے

رہ گئی یاد اک وہی صورت
اب وہی ایک دھیان باقی ہے

اُڑ گئے سب مکان کے پنچھی
اک شکستہ مکان باقی ہے

کھو چکے ہم یقین کی دولت
وہم قائم، گمان باقی ہے

کھا گیا شیر خود شکاری کو
بس شجر پر مچان باقی ہے

فاقے کر کر کے مر گیا ہاری
کھیت بنجر، لگان باقی ہے

زخم تو مندمل ہوا پھر بھی
زخم کا ہر نشان باقی ہے

سہہ گیا یہ بھی حادثہ شاہینؔ
اب بھی زندہ ہے، جان باقی ہے

❁

اپنا لہو ہے مطلعِ انوار، دیکھنا
پیدا ہوئے ہیں صبح کے آثار، دیکھنا

کیا صبح و شام اپنا ہی پندار دیکھنا
ڈھہ جائے نہ یہ ریت کی دیوار، دیکھنا

میرے سوا ہے کون گنہگار، دیکھنا
آیا ہے آج کون سرِ دار، دیکھنا

بازو بنیں گے اب مرے پتوار، دیکھنا
میرا بھی حوصلہ ذرا منجدھار، دیکھنا

سرخی ہمارے نام کی ہو گی لگی ہوئی
کل صبح تم بھی دوستو، اخبار دیکھنا!

کہنے کو یوں تو لوگ ملیں گے بہت مگر
مشکل بہت ہے صاحبِ کردار دیکھنا

در پر ترے متاعِ دل و جاں لیے ہوئے
بِکنے خود آ گیا ہے خریدار دیکھنا

کیا دوستوں کا ذکر کہ مجھ کو نہیں پسند
دشمن کو بھی ستم کشِ آزار دیکھنا

لہجہ بلند کر نہ دمِ گفتگو کبھی
خوددار ہم بھی ہیں بڑے سردار، دیکھنا

سنگِ صدا ہوا میں اگر میں اُچھال دوں
لفظوں میں کائنات گرفتار دیکھنا

اے دوست تم بھی شہر کی آب و ہوا سے دُور
چھوٹا سا اِک مکان ہوادار دیکھنا

کیوں آہنی فصیل سے ٹکرا رہے ہو تم
شاہین اپنی کاغذی دیوار دیکھنا

پہلے تمھارے حُسن نے آشفتہ سر کیا
آوارگی کے شوق نے پھر دربدر کیا

اب تو خیال بھی مجھے گھر کا نہیں رہا
اِس طرح بے گھری نے مرے دل میں گھر کیا

آنکھوں کو میری حسنِ نظر سے سنوار کر
اہلِ جہاں میں اُس نے مجھے دیدہ ور کیا

رخصت ہوئیں نہ گھر سے بلائیں تمام عمر
''ہم نے ہی اِس جہان سے آخر سفر کیا''☆

شب کی فصیل کٹ گئی عزمِ صمیم سے
دن کا پہاڑ ولولۂ دل نے سر کیا

سمجھو تو یہ عذاب بھی دنیا میں کم نہیں
کیوں اِس جہان میں مجھے اہلِ ہنر کیا

گردن میں آ گئی تھی کجی کبر و ناز کی
دستار گر گئی مری، اونچا جو سر کیا

اِس داستاں کو ایک غزل میں سمو دیا
قصّہ جو تھا طویل، اُسے مختصر کیا

شاہیںؔ ہر ایک بزم میں میرا ہی ذکر تھا
اِس عشق نے تو مجھ کو بہت معتبر کیا

☆ خواجہ میر دردؔ

❀

کہانی ہماری مکمّل ہوئی
ملاقات اُس سے مفصّل ہوئی

وہ اِک شام آیا تھا گھر پر مرے
وہی شام شاموں میں افضل ہوئی

سجاتا تھا جو بزم، رخصت ہوا
وہ بزمِ سخن اب معطّل ہوئی

مرا نام ہی اُس نے پوچھا تھا بس
عجب شہر میں ایک ہلچل ہوئی

جو تھا کارِ مشکل، وہ آساں ہوا
مگر پہلے سعیِ مسلسل ہوئی

اِک عالم تھے، نکلے مگر مبتدی
مری گفتگو اُن سے جب کل ہوئی

تھی شاہین آنے کی اُن کے خبر
درِ دل پہ آہٹ سی ہر پل ہوئی

❁

زخمِ جگر بھی جاگ اُٹھا تھا
درد بھی دل میں حد سے ہوا تھا

یاد تمھاری کیا آئی تھی
پھر سے ستم کا باب کھلا تھا

مثلِ شجر وہ شخص کھڑا تھا
دھوپ میں سایہ بانٹ رہا تھا

میرا ہی ہم زاد تھا جس نے
دکھ میں میرا ساتھ دیا تھا

دریا کا احسان ہے مجھ پر
وہ بھی میرے ساتھ بہا تھا

تھا جو نفسیّات کا ماہر
بچّوں کو وہ ڈانٹ رہا تھا

اُس سے کتنی بات ہوئی تھی
جس نے مجھ سے کچھ نہ کہا تھا

بھول ہوئی تھی مجھ سے سرزد
دل کا کہنا مان لیا تھا

پھر سے ہوں تاوان کی زد پر
بیچ کے گھر تاوان دیا تھا

ڈاکا جس نے ڈالا شاہیںؔ
گھر کا چوکی دار رہا تھا

❀

بج اُٹھے پھر گجر، اور کیا چاہیے!
آ گئی وہ سحر، اور کیا چاہیے!

شہرِ دل کے اُجڑنے کا غم تھا بہت
سج گیا یہ نگر، اور کیا چاہیے!

تم کو دیکھا تو ہم شعر کہنے لگے
ہو گئے باہنر، اور کیا چاہیے!

اُن کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں، دیکھنا
اے مری چشمِ تر، اور کیا چاہیے!

زندگی ہے جو کم، غم بھی ہے کم سے کم
عمر ہے مختصر، اور کیا چاہیے!

شعر تیرے بھی اُن کو پسند آ گئے
ہو گئے معتبر، اور کیا چاہیے!

کیسا ویران تھا، کتنا آباد ہے!
سج گئے بام و در، اور کیا چاہیے!

جو گزرتے ہیں صدمے مری جان پر
وہ بھی ہیں باخبر، اور کیا چاہیے!

تم ہو شاہیں یہاں تو کبھی ہو وہاں
ہے سفر ہی سفر، اور کیا چاہیے!

وہ غزلیں مری گنگنانے لگے ہیں
یوں نزدیک تر مجھ سے آنے لگے ہیں

غموں کی یہ بارش قفس میں کہاں تھی
قفس سے برے آشیانے لگے ہیں

نہیں چھوڑنا کہہ کے یہ نوکری تم
'مرے پوت اب تو کمانے لگے ہیں'

حقیقت بیاں کی تو کہنے لگے وہ
بہت دل نشیں یہ فسانے لگے ہیں

سمجھنا محبت کا آساں ہے کوئی
سمجھنے میں اِس کو زمانے لگے ہیں

وہ سپنے تھے سپنے حقیقت کہاں تھے
مگر خواب کتنے سہانے لگے ہیں

ترقّی بھی ہے اور آلودگی بھی
مرے گاؤں میں کارخانے لگے ہیں

حماقت بھی سرزد اُنھیں سے ہوئی ہے
جو یوں دیکھنے میں سیانے لگے ہیں

چھوڑا جو سب کو، آ گیا ہوں اپنی راہ پر
بھٹکا دیا تھا لوگوں نے ورنہ اِدھر اُدھر

مہران تیری وادی سے رشتہ مرا اَمر
ملنا ہے تیری خاک میں، جاؤں گا جب گزر

پڑھ لی کوئی کتاب یا لکھ لی کوئی غزل
اکثر گزارتا ہوں یوں ہی رات جاگ کر

رسمِ وفا تو مجھ سے ہی شاید نہ نبھ سکی
رکھتا نہیں اے دوستو! الزام آپ پر

حاملِ سفر ملا جو، رُکا تھوڑی دیر کو
رکھ دو مرے وجود کا اب نام ہی سفر

خوفِ درندگی ہے تو آبادیوں میں ہے
جنگل میں اب تو جانے سے لگتا نہیں ہے ڈر

کہنے لگا وہ آفتی اِک دن بصد غرور
دیکھی ہے ایسی شکل بھی رُوے زمین پر!

رشتہ ہر اِک مقام سے، اِتنا ہی بس رہا
آئی جہاں بھی رات، وہیں ہم گئے ٹھہر

شاہینؔ ہم بھی لٹتے رہے میرؔ کی طرح
سو بار اپنے دل کا بھی لوٹا گیا نگر

کتنا شاداب ہے، کس قدر دل نشیں، خوشبوؤں سے بسا ہے یہ اپنا چمن
یہ مری جان ہے، میرا ایمان ہے، کتنا پیارا ہے دیکھو یہ میرا وطن

سب ستم اِس کی خاطر گوارا کیے، گرتے پڑتے رہے، آگے بڑھتے رہے
اِس کو پاتے ہی آرامِ جاں آ گیا، دُور سب ہو گئی جسم و جاں کی تھکن

یہ زمانہ تو ہم ہی سے تعبیر ہے، یہ نہ بدلے تو پھر کس کی تقصیر ہے
ہم بدلتے نہیں، چاہتے ہیں یہی، بس زمانہ بدل دے خود اپنا چلن

کیا سیاست تھی، کس کی سیاست تھی وہ، جو تھا اپنا وہ ہم سے جدا ہو گیا
سوچنے سے نہیں اب کوئی فائدہ، پھر سے مل جائیں، اِس کا کریں ہم جتن

تم نے عہد وفا بھی کیا تھا کبھی، بات رکھی نہ ظالم زباں کی مگر
میں ہوں قائم وچن پر مگر آج تک، توڑ ڈالا ہے تم نے ہی اپنا وچن

اپنی یادوں کے البم کو کھولے ہوئے، دیر تک دیکھتا میں رہا غور سے
جن کو بھولا ہوا تھا وہ چہرے ملے، پھر بھی یاد کی کیا حسیں انجمن

کیسے مچلے نہیں دیکھ کر میرا من، یہ حسیں صورتیں، دل نشیں مورتیں
گھر سے نکلے تو نظریں سنبھلتی نہیں، اپنے قابو میں رہتا ہے کب اپنا من

ایک معصوم لڑکے کو پٹتا ہوا، میں نے دیکھا مگر کچھ نہیں کر سکا
چوٹ جیسے لگی جسم پر ہو مرے، دُکھ رہا ہے یہ کیوں آج میرا بدن

❀

جن کے شاہیں حبیب ہوتے ہیں
ہاں، اُنھی کے رقیب ہوتے ہیں!

اہلِ ثروت ہیں جن کے حاجت مند
ایسے بھی کچھ غریب ہوتے ہیں

جو نگاہوں سے دُور ہیں جتنے
اتنے دل کے قریب ہوتے ہیں

دینے والے سے کیا کریں شکوہ
اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں

پھر حقیقت بھی اپنی کھلتی ہے
آئینے جب قریب ہوتے ہیں

دیکھیں آنکھوں سے جو وہی لکھیں
ایسے کتنے ادیب ہوتے ہیں

گفتگو ہو عمل کا مظہر بھی
سب کہاں، کچھ خطیب ہوتے ہیں

اپنی ہستی سے دُور ہوتا ہوں
جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں

دولتِ غم اُنھی کو ملتی ہے
جو بہت خوش نصیب ہوتے ہیں

سرحدِ اِدراک سے باہر کبھی آیا کرو
اِک تصوّر ہو حسیں اور اُس میں کھو جایا کرو

وہ بھی آئے گا تمھارے گھر پہ اِک دن، دیکھنا
وہ نہیں آتا، نہ آئے، اُس کے گھر جایا کرو

تم کو تنہائی پہ ہو گا ایک محفل کا گماں
کہہ لو اِک تازہ غزل اور پھر اُسے گایا کرو

مشک کی خوش بُو پہ اب مائل کوئی ہوتا نہیں
باہنر ہو تو ہنر اپنا بھی جتلایا کرو

اِس کہانی پر حقیقت کا گماں ہو جائے گا
وقفے وقفے سے اسی قصّے کو دُہرایا کرو

حال میں رہتے ہوئے لو سانس مستقبل میں تم
یوں حدودِ وقت سے آگے نکل جایا کرو

کیسے کیسے وسوسے اب گھیر لیتے ہیں مجھے
لوٹ کر مت دیر سے اے جان گھر آیا کرو

تم سے اے شاہیںؔ گر برتے کوئی بیگانگی
تم بھی اُس کے سامنے اَن جان بن جایا کرو

غم آشنا لمحوں کا اُجالا ہے زمیں پر
یا میری محبت کا حوالا ہے زمیں پر

ہو جاؤ گے گم، ورنہ اندھیروں میں گماں کے
کھونا نہ یقیں کو، یہ اجالا ہے زمیں پر

بد ہو کے بھی، بدنام تو ہونے سے بچا ہوں
اچّھا ہے، نہیں جاننے والا ہے زمیں پر

چاہے ہے تجھے، تُو جسے چاہے ہے، اسُے بھی
ایسا بھی ترا چاہنے والا ہے زمیں پر

ہم سب کو ضرورت تو محبت کی رہی ہے
نفرت کو مگر ہم نے ہی پالا ہے زمیں پر

کس واسطے چلتا ہے زمیں پر تو اکڑ کر
اے شخص اجل کا تو نوالا ہے زمیں پر

کیا ٹوٹ کے چاہا تھا کبھی مجھ کو کسی نے!
میری بھی محبت کا حوالا ہے زمیں پر

اُردو کی زمیں آج بھی غالبؔ کی زمیں ہے
غالبؔ کی غزل ارفع و اعلا ہے زمیں پر

شاہینؔ ہر انسان ہے دنیا میں برابر
پھر کس نے یہ کیوں تفرقہ ڈالا ہے زمیں پر

❀

اُس کو سُنا کے اپنی جو ہم داستاں چلے
خوش وقت، شاد کام ہوئے، کام راں چلے

اشکِ رواں کی شکل میں دردِ نہاں چلے
پھر آرزوے شوق کے یہ کارواں چلے

پُرفن بھی، خوب رُو بھی ہے، شیریں مقال بھی
اب اُس کے سامنے بھلا کس کی زباں چلے

وہ قامتِ حسین، بوقتِ خرامِ ناز
ایسا لگے ہے سرو بچشمِ گماں چلے

رُک جائے تو زمین رُکے، آسماں رُکے
جب چل پڑے تو ساتھ مہ و کہکشاں چلے

احساس یوں ہوا کہ جہاں سے گزر گئے
جب چھوڑ کے اُس شوخ کا ہم آستاں چلے

یہ ہے عطائے عشق کہ مرنے کے بعد بھی
ہو ذکر جب وفا کا، مری داستاں چلے

شاہیںؔ رہ سکے گا نہ زندہ ترے بغیر
اب چھوڑ کر اِسے کہاں اے مہرباں چلے

یوں تو کہنے کو گھر پہ رہتے ہیں
ہم تو اُس کے ہی در پہ رہتے ہیں

ساتھ اُن کا کبھی جو ہوتا ہے
رنگ و بُو کے سفر پہ رہتے ہیں

ایسے دنیا میں رہتے ہیں ہم تو
جوں مسافر سفر پہ رہتے ہیں

جن کو ملتی ہے دولتِ دنیا
وہ تو سب کی نظر پہ رہتے ہیں

ہاں، برستے ہیں تب تلک پتھر
جب تلک پھل شجر پہ رہتے ہیں

یہ خبر ملتی ہے کہ باہر ہیں
لوگ ایسے بھی گھر پہ رہتے ہیں

کیا حقیقت ہے، کیا فسانہ ہے!
ہم تو شاہیںؔ خبر پہ رہتے ہیں

جو اندر ہے، باہر دیکھا
سات رُتوں کا منظر دیکھا

اُس کا ذکر کروں میں کیسے
کل جو ندی کے تٹ پر دیکھا

جانے روگ لگا یہ کیسے
اُس کو تو بس پل بھر دیکھا

اَن جانے میں کیا کہہ بیٹھا
اُس نے کیوں مڑ مڑ کر دیکھا

غم سے پایل باندھ لی اُس نے
سب نے دکھ کا منظر دیکھا

یاد بہت آتے ہیں بچے
دور یہ گھر سے رہ کر دیکھا

شاہیںؔ تیرے شعر کو ہم نے
دکھ کا ایک سمندر دیکھا

❀

سُنتا ہوں جب تیری باتاں
یاد آتے ہیں وہ دن راتاں

دولت نے یہ فرق مٹایا
کوئی نہ پُچھّے اُچیاں ذاتاں

تجھ بن ساجن حال عجب ہے
اکھیاں وچ اُڈن برساتاں

غربت کیا اُپرادھ ہے کوئی
ٹوٹ گئے سب رشتے ناتاں

تجھ کو کلیاں ہی جانا ہے
کوئی نہ منزل تک دے ساتھاں

شاہیں پگ پگ دیکھ کے چلنا
لوگ لگائے بیٹھے گھاتاں

✿

اپنے دل کی حکایتیں لکھو!
اُن سے ہیں جو شکایتیں لکھو!

ہر مصیبت لو اپنے حصے میں
اُن پہ ساری عنایتیں لکھو!

نقش بہتر نہیں کوئی اس سے
دل پہ قرآں کی آیتیں لکھو!

جو مخالف تمھارے تھے، اُن سے
کیوں ملی ہیں حمایتیں، لکھو!

حرف تازہ لکھو جو لکھنا ہے
ورنہ مرضی، روایتیں لکھو!

شعرگوئی پیمبری بھی ہے
جو ملی ہیں ہدایتیں، لکھو!

شعر و تنقید جو بھی لکھتے ہو
ہیں خدا کی عنایتیں، لکھو!

جانے والا لوٹ کر آیا نہیں
اُس کو شاید یہ نگر بھایا نہیں

زندہ ہے زندہ رہے گا اُس کا فن
اپنے فن پر جو کہ اِترایا نہیں

اُس کی باتیں، اُس کی فطرت کے خلاف
میں سمجھ کر بھی سمجھ پایا نہیں

روشنی سے ہو گئی ثابت یہ بات
جسم سے ہوتا جدا سایا نہیں

شاعری اظہار ہے غم کا مرے
اشک آنکھوں میں کبھی آیا نہیں

اُس کی بخشش، دے رہا ہے بے طلب!
میں نے اپنا ہاتھ پھیلایا نہیں

یاد کرتا ہے تجھے جو رات دن
کیا کبھی تجھ کو وہ یاد آیا نہیں

غم زدوں کی خیریت ہی پوچھتے
تم سے شاہیںؔ یہ بھی ہو پایا نہیں

✿

اِس نگر، اُس نگر میں رہتے ہیں
ہم مسافر سفر میں رہتے ہیں

ہو گئیں خواب محفلیں شب کی
شام سے اپنے گھر میں رہتے ہیں

اِس لیے بے خبر بہت ہیں ہم
صاحبانِ خبر میں رہتے ہیں

فنِ تخلیق ہم پہ واضح ہے
کوچۂ کوزہ گر میں رہتے ہیں

جو حقیقت سے ہیں گریزاں وہ
داستاں کے اثر میں رہتے ہیں

چاند چہرہ نظر میں رہتا ہے
چاندنی کے نگر میں رہتے ہیں

سب کی نظریں ہمیں پہ رہتی ہیں
جب سے اُس کی نظر میں رہتے ہیں

ہاں، کراچی ہمارا مسکن ہے
شہرِ علم و ہنر میں رہتے ہیں

زد میں آتے نہیں شکاری کے
جو پرندے سفر میں رہتے ہیں

روز ہوتا ہے امتحاں اپنا
حلقۂ خیر و شر میں رہتے ہیں

ہم تو خود ہیں ہُما صفت شاہیںؔ
کب ہُما کے اثر میں رہتے ہیں

رکھ دو اے شاہینؔ اب تیر و کمان
ہے پرندے کی بہت اونچی اڑان

جب بھی چاہو پھر جگا دینا مجھے
سو رہا ہوں اوڑھ کر لمبی تکان

اب ہوا سے بھی ہوئے محروم ہم
جب سے بننے لگ گئے اونچے مکان

اُس کو پہنچائیں گے ہم تکمیل تک
جو لیا ہے دل میں اپنے ہم نے ٹھان

خونِ دل سے کِشت یہ ہوگی ہری
شاعری کو اِس قدر آساں نہ جان!

نیک و بد سمجھائیں اُس کو کس طرح
میری باتوں کا برا جاتا ہے مان

حد بھی اُس کی ہے کوئی بندہ نواز!
تا بہ کے ہوتا رہے گا امتحان

حوصلہ بے حساب رکھتے ہیں
بحر کا اضطراب رکھتے ہیں

ہم بھی کچھ چاہتے ہیں بن جانا
اپنی آنکھوں میں خواب رکھتے ہیں

ہے خدا مہرباں بہت ہم پر
ہر قدم کام یاب رکھتے ہیں

دونوں عالم میں سرخ رُو کر دے
ایک ایسی کتاب رکھتے ہیں

حد سے آگے کبھی نہیں بڑھتے
عشق کا اِک نصاب رکھتے ہیں

رنگ دیتے ہیں آرزوؤں کو
ہر تمنّا گلاب رکھتے ہیں

شکل بگڑی نظر تو آئے گی
آئینہ کیوں خراب رکھتے ہیں

سب پہ غالبؔ ہیں اِس لیے غالب
ہر سخن لاجواب رکھتے ہیں

اُن کے بے جا سوال کا شاہیںؔ
ہم مناسب جواب رکھتے ہیں

❁

بہت دل گیر ہوتی جا رہی ہے
وہ سچ مچ ہیر ہوتی جا رہی ہے

نمائش میں نظر سب کی ہے اُس پر
وہ خود تصویر ہوتی جا رہی ہے

غزل کو آج وہ شہرت ملی ہے
کہ عالم گیر ہوتی جا رہی ہے

جو احساں میں نے اُس پر کچھ کیے ہیں
مری تقصیر ہوتی جا رہی ہے

خبر کب لو گے تم، مجھ کو بتا دو
بہت تاخیر ہوتی جا رہی ہے

زباں پر بات جو آئی نہیں تھی
وہ کیوں تحریر ہوتی جا رہی ہے

فراوانی ہے ایسی غم کی یارو
مری جاگیر ہوتی جا رہی ہے

وہ آئے شہر میں اپنے تو شاہیںؔ
فضا کشمیر ہوتی جا رہی ہے

❁

ہجر کے قصّے بھی ہم لکھتے رہے
آرزوے وصل بھی کرتے رہے

اُس پہ مر کے ہم تو بس مرتے رہے
جس کی صورت دیکھ کر جیتے رہے

کی نصیحت دوسروں کو عمر بھر
اور خود کارِ دگر کرتے رہے

دوسروں کا غم بھی اپنا غم بنا
ہم پرائی آگ میں جلتے رہے

راستے جو پُرخطر، دشوار تھے
ایسی ہی راہوں پہ ہم چلتے رہے

دوستوں کی بزم لی میں نے سجا
سانپ تنہائی کے جب ڈستے رہے

آرزوؤں کا ہوا اظہار یوں
شعر کی صورت میں وہ ڈھلتے رہے

یہ بھی تھا شاہیںؔ ہمارا حوصلہ
جبر کے عالم میں بھی ہنستے رہے

شاعری کرتے رہے ہو عمر بھر
حرف کتنے تم نے لکھے معتبر

خود کو رکھتے ہیں بہت مصروف ہم
جانتے ہیں زندہ رہنے کا ہنر

کس قدر بد ذوق اور ظالم بھی ہیں
تتلیوں کے نوچ دیتے ہیں جو پر

نیک و بد سے لاتعلّق ہو گیا
جس کے اندر کا گیا انسان مر

دستکوں پر دستکیں دیتے رہو
ایک دستک پر نہیں کھلتا ہے در

ایک منصوبہ بنا لے سوچ کر
پھر نہیں کچھ سوچنا، بس کر گزر

اُس نے دانستہ دیے کتنے فریب
ہم نے کھائے کتنے دھوکے جان کر

جس میں ہو نہ شعورِ انسانی
وہ تو ہے جانور سے بھی بدتر

ہے تقاضا وقت کا شاہیںؔ یہی
جائیے دفتر سے سیدھے اپنے گھر

شاد ہم کو جو خوب رُو کرتے
ہم بھی جینے کی آرزو کرتے

تم بھی پڑھنے گئے نمازِ عشق
پہلے لازم یہ تھا وضو کرتے

خودنمائی تمھاری مٹ جاتی
آئینے میں اگر جو ہُو کرتے

اُس کی چاہت نکال دی دل سے
دل کو کب تک لہو لہو کرتے

کھیلتے تھے جنوں میں دامن سے
چاک کرتے کبھی رفو کرتے

داد پاتے ہیں شعرِ کم تر پر
یہ کرشمہ ہیں خوش گلو کرتے

اُس کے کہنے میں آ گئے کیوں تم
بات ہم سے تو دوبدو کرتے

ہم پہ ہی فرض جاں نثاری تھی
ہم نہ کرتے تو کیا عدو کرتے

کھو گیا جب سے وہ متاعِ جاں
قریہ قریہ ہیں جستجو کرتے

کوئی کارِ ہنر جو کر جاتے
ذکر اپنا بھی کوبکو کرتے

کشتۂ آرزو ہیں ہم شاہیںؔ
لوگ کیونکر ہیں آرزو کرتے

دل زخم ترا، آنکھ بھی نم ہے کہ نہیں ہے
تجھ پر بھی زمانے کا کرم ہے کہ نہیں ہے

غم اپنا اُٹھاتے ہیں سبھی اے دلِ وحشی
کہنا تجھے اوروں کا بھی غم ہے کہ نہیں ہے

تاریخ سکھا دیتی ہے انساں کو بہت کچھ
تاریخ بتا تیری رقم ہے کہ نہیں ہے

اُس کوچے میں جانے کا مدار اب ہے اِسی پر
اُس کوچے میں رہتا وہ صنم ہے کہ نہیں ہے

پڑھ کر مری تحریر چلا آیا ہے ملنے
دیکھو مری تحریر میں دم ہے کہ نہیں ہے

لکھنا وہی جو صرف تقاضا ہو قلم کا
رکھنا تجھے کچھ اپنا بھرم ہے کہ نہیں ہے

بس اُن کے کرم ہی سے تو پہنچے ہیں یہاں تک
یہ اُن کا کرم اُن کا کرم ہے کہ نہیں ہے

عظمت کا نشاں اب یہی ٹھہرا ہے کہ کوئی
دارائے زر و سیم و رقم ہے کہ نہیں ہے

اب اِس پہ یقیں کیسے اے شاہینؔ کریں ہم
ہر بات پہ کھاتا وہ قسم ہے کہ نہیں ہے

چراغِ مہر و محبت جلائے رکھنا ہے
کہ دُور شہر سے نفرت کے سائے رکھنا ہے

نہ دیکھ مڑ کے تُو، منزل پہ رکھ نظر اپنی
قدم جو بڑھ گئے، آگے بڑھائے رکھنا ہے

یہی ہے ظلمتِ شب سے نجات کی صورت
چراغِ عزم و عمل کو جلائے رکھنا ہے

غزل کہی ہے یہ کل رات، جاگ کر میں نے
اب آج اہلِ سخن کو جگائے رکھنا ہے

جو رازدار بنا ہے تمھارا، اُس سے بھی
جو راز، راز ہے اُس سے چھپائے رکھنا ہے

میں جپ رہا ہوں تمھارے ہی نام کی مالا
تمھاری یاد میں دھونی رمائے رکھنا ہے

وہ شعر کہتے ہیں لیکن پتا نہیں اُن کو
کہاں پہ رمز و علامت، کنائے رکھنا ہے

* ہماری بزم کی رونق تھے دوستو افسرؔ
اب اُن کی یاد میں محفل سجائے رکھنا ہے

ہمیں تو یاد ہے افسرؔ، یہ آپ کا مسلک
ہو کوئی دوست یا دشمن، بنائے رکھنا ہے

جو بن سکے نہیں اپنے تو غیر بن جاؤ
ہر ایک شکل میں تم سے نبھائے رکھنا ہے

* افسر ماہ پوری

مجھے تم سے، تمھیں مجھ سے محبت ہو بھی سکتی تھی
ضرورت مند دونوں تھے، یہ صورت ہو بھی سکتی تھی

سفر کا راستہ کچھ سوچ کر ہی تو بدل ڈالا
وگرنہ چاہتا میں تو رفاقت ہو بھی سکتی تھی

شکایت کا دیا تم نے جو موقع جان کر مجھ کو
شکایت کر بھی سکتا تھا، شکایت ہو بھی سکتی تھی

کسی کی دُوراندیشی ہی آئی کام ہم سب کے
وگرنہ ضد پہ ہم سب تھے، عداوت ہو بھی سکتی تھی

یہ مانا کچھ نہیں تھا میں، مگر یہ بھی تو ممکن تھا
کسی بھی موڑ پر میری ضرورت ہو بھی سکتی تھی

بیاں جو کر رہا تھا وہ بہت پُردرد لہجے میں
کہانی ہم سمجھ بیٹھے، حقیقت ہو بھی سکتی تھی

کسی پر ظلم ہوتا دیکھ کر کچھ بھی نہ کر پایا
جسارت مجھ میں گر ہوتی، حمایت ہو بھی سکتی تھی

چلو اچّھا ہوا کہ صلح کر لی اُس نے کل تم سے
جو آ جاتا مقابل وہ، ہزیمت ہو بھی سکتی تھی

خدا نے رکھ لیا ایماں سلامت، ورنہ یہ ڈر تھا
کہ اک بت کے لیے بت سے عقیدت ہو بھی سکتی تھی

تری عجلت پسندی نے بگاڑا کام اے شاہیںؔ
جو تُو نے خواب دیکھا تھا، حقیقت ہو بھی سکتی تھی

محنت کشوں کے عزم کی ہیں یہ نشانیاں
کیا جھومتی ہیں، دیکھیے، گندم کی بالیاں

خونِ جگر سے سینچتا رہتا ہوں فصل کو
آتی رہیں، بلا سے مری، خشک سالیاں

دن بھر کے کام سے تھکے ہارے ہوئے کساں
چوپال میں وہ سنتے ہیں جا کر کہانیاں

ایسے بھی کم نظر ہیں، نہیں سنتے کوئی بات
رخصت ہوئی ہیں شہر سے روشن خیالیاں

خود غرضیوں کی آگ ہے ایسی لگی ہوئی
کچھ لوگ محسنوں کو بھی دیتے ہیں گالیاں

وہ دور اب تو قصۂ پارینہ ہو چکا
سنتے تھے جب بزرگوں سے بچّے کہانیاں

ایسے بھی کچھ خبیث لٹیرے ہیں شہر میں
کانوں سے چھین لیتے ہیں بچّی کی بالیاں

اپنے چمن کا حُسن ہے دنیا میں بے مثال
فردوس بر زمیں ہیں، یہ سرسبز وادیاں

ہاری غریب ہیں مگر مہماں نواز ہیں
مشہور اُن کی جگ میں ہیں مہماں نوازیاں

ہو صاحبِ کمال تو دکھلاؤ اپنا فن
شاہینؔ تم تو صرف بجاتے ہو تالیاں

تم جو آئے لوٹ کر، مجھ پر جوانی آ گئی
یاد پھر کتنی مجھے رنگیں کہانی آ گئی

پھر مری شام و سحر میں آ گئیں رعنائیاں
صبح روشن، شب منوّر، رُت سہانی آ گئی

شعر میں کہنے لگا تیرے لب و رخسار پر
تم چلے آئے تو مجھ کو گل فشانی آ گئی

یہ خزاں آسا چمن ہے گل بداماں کس قدر
ایسا لگتا ہے بہارِ جاودانی آ گئی

تیری آمد سے مجھے اب ہو گیا ہے یہ یقیں
غم کے بادل چھٹ گئے ہیں، شادمانی آ گئی

بلبلوں کی نغمہ سنجی ہو گئی تھی بے سُری
تجھ کو جب دیکھا تو اُن کو نغمہ خوانی آ گئی

اُس کی آمد سے کُھلے شاہیں دریچے ذہن کے
بھولی بسری یاد پھر کتنی کہانی آ گئی

ماحول دل شکن سہی، ہمّت جواں رہے
انسان جس زمیں پہ رہے، آسماں رہے

مجھ سے بہت قریب، بہت ہی قریب تھے
لیکن کبھی مجھی سے وہ دامن کشاں رہے

اُن کا ہی عکس آئینے میں جلوہ گر رہا
ہرچند وہ نگاہوں سے میری نہاں رہے

تھی اُس کی بزمِ ناز یا کوئی حسین خواب
اب کیا بتائیں ہم تمھیں، کل شب کہاں رہے

ہیں موج زن خیال میں سرمستیاں سی کچھ
کیا تم بھی مہوشوں کے کبھی درمیاں رہے

ہم کو ہمارے رب نے ہی یہ حوصلہ دیا
ہر رنج، ہر بلا میں جو ہم شادماں رہے

وابستہ تیرے در سے ہے اب اُس کی زندگی
اٹھ جائے تیرے در سے تو شاہیںؔ کہاں رہے

اُنھیں کو یاد کرتے ہیں سوادِ شام سے پہلے
دیے آنکھوں کے جلتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

اُنھیں گر لکھ سکیں تو شاعری کا رُخ بدل جائے
وہ شہ پارے اُترتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

وہ ہوتے شہر میں تو شام کی ہم سیر کر لیتے
کفِ افسوس ملتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

کبھی وعدہ جو کرتے ہیں تو ہوتا ہے یہی اکثر
وہ وعدے سے مکرتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

پرانے غم بھلا دیں اور نئے سانچے میں ڈھل جائیں
جتن کیا کیا نہ کرتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

اُنھیں کی یاد آتی ہے، اُنھیں کا ذکر ہوتا ہے
یہی اِک کام کرتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

عجب وہ بے بسی کا وقت ہوتا ہے، کہیں کس سے
نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں، سوادِ شام سے پہلے

اُنھیں اشکوں کے پانی سے بجھا دیتے ہیں ہم شاہیںؔ
جو داغِ دل سلگتے ہیں سوادِ شام سے پہلے

❁

شیدا سبھی ہیں اِس کے، وہ صورت غزل کی ہے
اہلِ سخن کے دل میں حرارت غزل کی ہے

سکّہ اُسی کا چلتا ہے سارے جہان میں
ہاں کشورِ ادب میں حکومت غزل کی ہے

آداب عاشقی کے اُسی نے سکھائے ہیں
فیضان ہے اُسی کا، بصیرت غزل کی ہے

اُن کو غزل پسند ہے، کہتے ہیں ہم غزل
دونوں میں، اب یہ دیکھیے، قربت غزل کی ہے

وہ چاہتے ہیں اُن پہ بھی لکھ دوں کوئی غزل
صورت غزل کی ہے نہ تو سیرت غزل کی ہے

گل دستہ اِک حسین ہے فکرِ جمیل کا
کچھ بے سبب نہیں یہ حمایت غزل کی ہے

لکھنے لگے ہیں ڈائری میں وہ مری غزل
مجھ پر بڑا کرم، یہ عنایت غزل کی ہے

بزمِ سخن میں پہلے پڑھے مبتدی غزل
آدابِ بزم ہے، یہ روایت غزل کی ہے

اُن سے غزل کے پردے میں ہوتی ہے گفتگو
شاہؔین دیکھنا یہ کرامت غزل کی ہے

یوں ہے فانی فنا کا شکار آدمی
ہو جو حسنِ عمل، پائیدار آدمی

گر برے ہیں بہت، کچھ تو اچھے بھی ہیں
ہیں انھیں میں مگر شان دار آدمی

کس کو سمجھائیں ہم اور کس سے بچیں
ایک سے ایک ہے ہوشیار آدمی

آدمیت کی خُو بُو نہیں اُس میں جب
کیسے کہہ دوں کہ ہے باوقار آدمی

کام انساں کے ہیں جو وہ کرتا نہیں
کر رہا ہے عجب کاروبار آدمی

بات حق کی کہے، اُس پہ قائم رہے
آدمی ہے وہی جان دار آدمی

زخمیوں کی مدد کو نہ آیا کوئی
یوں سڑک پر کھڑے تھے ہزار آدمی

وہ ہے جہلِ مرکّب، بچو اُس سے تم
بن نہ جائے گلے کا وہ ہار آدمی

مرتے دم تک نہ اوروں کا محتاج ہو
آدمی پر نہ بن جائے بار آدمی

مل کے شاہیؔن سے شاد ہو گے بہت
ہے بڑا ہی وہ باغ و بہار آدمی

خوش رنگ ہم جو منظر باہر کے دیکھتے ہیں
سب رنگ اپنے دل کے اندر کے دیکھتے ہیں

طرزِ کلام اُس کا، سنتے ہیں دل نشیں ہے
آؤ نا! بات اُس سے ہم کر کے دیکھتے ہیں

آتا ہے جب بھی ملنے وہ ہم سے اتفاقاً
ہم دیکھتے ہیں اُس کو، جی بھر کے دیکھتے ہیں

حالات اب یہاں کے کچھ ایسے ہو گئے ہیں
آ جائے اجنبی تو ہم ڈر کے دیکھتے ہیں

سنتے ہیں جان و دل کا، اس میں ضرر بہت ہے
ہم بھی ذرا کسی پر یہ مر کے دیکھتے ہیں

دشمن ہمارا شاہیںؔ کوئی غیر تو نہیں ہے
جتنے عدو ہیں اپنے سب گھر کے دیکھتے ہیں

خطِ معکوس میں وہ لکھتے تھے
خط کو ہم آئینے میں پڑھتے تھے

اُس سے ملتے تھے، بات کرتے تھے
شعرگوئی کا ذوق رکھتے تھے

ہو گئے دُور کس قدر مجھ سے
وہ جو مجھ سے قریب رہتے تھے

تھا بزرگوں کا رعب کچھ ایسا
بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے

لوگ خوش تھے مری ترقّی پر
بعض جلتے تھے، رشک کرتے تھے

وقت کی آندھیوں نے جا گھیرا
جو صبا کا مزاج رکھتے تھے

بن گیا اُس کا بھی فسانہ کیوں
گر پڑوسی خیال رکھتے تھے

اُس سے بچنا کہ بے وفا ہے وہ
لوگ کہتے تھے، سچ ہی کہتے تھے

کہہ نہ پائے زباں سے جو شاہیںؔ
ہم غزل کی زباں میں کہتے تھے

❁

چاہتا ہے مجھ کو وہ دیوانہ وار
اِس لیے رہتا نہیں دل کو قرار

ٹوٹ جائے دل تو پھر جڑتا نہیں
کر لو تم لاکھوں جتن، کوشش ہزار

مشکلوں میں حوصلہ ہارو نہیں
ٹوٹ جائے گا غموں کا ہر حصار

ایک دھندلی سی کرن ہے سامنے
زندگی کا ہے اِسی پر انحصار

وہ جو آئے تو گماں ہونے لگا
آ گئی پھر لوٹ کر شاید بہار

دیکھیے، مجھ کو نہ ایسے دیکھیے
دل پہ رہتا ہی نہیں ہے اختیار

عشق کی وارفتگی ایسی بڑھی
اِس جنوں میں کر دیا سب کچھ نثار

شعرخوانی کا کہاں اب حوصلہ
ہو مُصر تم تو چلیے چلتے ہیں یار

واقعے نے رنگ دکھلائے بہت
اِک حقیقت کے بنے قصّے ہزار

جس غزل میں خونِ دل شامل ہوا
وہ غزل ہوتی ہے شاہیںؔ شاہ کار

جھولے میں ہم بھنور کے پڑے ڈولتے رہے
'اللّٰہ میری کر مدد' یہ بولتے رہے

تنہائیوں نے کر دیے تھے کان بے صدا
نغمے پرانی یاد کے رس گھولتے رہے

تھی رات وہ کٹھن بہت، اِس طرح کاٹ دی
وہ بولتے رہے، کبھی ہم بولتے رہے

کل ہم کو مل گئی تھی جو اچھّی سی اِک کتاب
پڑھتے رہے ہم اُس کو، گہر رولتے رہے

رہ جاتی شرم، خامشی کرتے جو اختیار
ہم بول کر خود اپنا بھرم کھولتے رہے

آیا نہ شعر میں ترے شاہینؔ شوخ رنگ
کیا کیا نہ رنگ شاعری میں گھولتے رہے

بچھڑ کر تم سے تنہائی بہت ہے
کہوں کیا، جاں پہ بن آئی بہت ہے

تمھارے واسطے بادِ بہاری
مری خاطر یہ پروائی بہت ہے

مجھے بھی عشق کا سودا ہوا ہے
سنا ہے اِس میں رسوائی بہت ہے

وہی غیروں سے آگے بڑھ گیا ہے
وہی جس سے شناسائی بہت ہے

حسیں ہے وہ بہت شیریں دہن بھی
مگر اُس میں چلبلاپائی بہت ہے

پڑھو بس شعر اس بزمِ سخن میں
جہاں فن کی پذیرائی بہت ہے

نہیں ہے 'لان' میرے گھر میں شاہیںؔ
مگر چھوٹی سی انگنائی بہت ہے

کیوں پوچھتے ہو ہم سے سکندر کی کہانی
ہم جانتے ہیں صرف قلندر کی کہانی

جو کچھ سنا تھا اُس پہ یقیں تم نے کر لیا
معلوم کچھ نہیں تمھیں اندر کی کہانی

تہہ میں سمندروں کی کبھی تم نہیں گئے
کیا خاک لکھ سکو گے سمندر کی کہانی!

ہر فرد کا عمل یہی کہتا ہے صاف صاف
سب لکھ رہے ہیں اپنے مقدّر کی کہانی

جس نے سخن کو اپنے سنوارا ہے فکر سے
لکھتے ہیں لوگ ایسے سخن ور کی کہانی

بچّے بھی باشعور بہت ہو گئے ہیں اب
پڑھتے نہیں وہ لومڑی بندر کی کہانی

ہے آئینہ ایّام کا شاہیںؔ ترا کلام
پنہاں ہے ترے شعر میں ہر گھر کی کہانی

سجا کے لایا ہوں میں نقدِ جاں ہتھیلی پر
کرو قبول، یہ ہے ارمغاں ہتھیلی پر

حسین نقشِ حنائی ہے ہاتھ پر اُن کے
سجائے بیٹھے ہیں وہ کہکشاں ہتھیلی پر

بجھے چراغ، ہتھیلی پہ جو جلائے تھے
چراغ چھوڑ گئے ہیں دُھواں ہتھیلی پر

نہ تھی لکیر کوئی اُس پہ کامرانی کی
بنایا نوکِ قلم سے نشاں ہتھیلی پر

جو چاہے لوٹ لے، خوفِ زیاں نہیں اب تو
لیے میں پھرتا ہوں اپنا مکاں ہتھیلی پر

بس ایک بار ملایا تھا ہاتھ اُس نے تو
ہے لمس آج تک اُس کا رواں ہتھیلی پر

مجھے پتا تھا جو انجام اُس کا ہونا تھا
جما کے دیکھتا سرسوں کہاں ہتھیلی پر

میں بات پھر بھی کہوں گا وہی جو سچی ہے
وہ لا کے رکھ بھی دے گر آسماں ہتھیلی پر

نشان چھوڑ کے شاہیں گیا ہتھیلی کے
لکھی تھی اُس نے بھی اک داستاں ہتھیلی پر

لکھیں گے روز نئی داستان کاغذ پر
اُتار دیں گے یوں اپنی تکان کاغذ پر

پھر اُس کے بعد ہی پختہ مکان بنتا ہے
بناتی پہلے ہے دنیا مکان کاغذ پر

یہ ڈھیر ساری کتابیں، مسوّدے، اخبار
کتاب خانوں کی ہے آن بان کاغذ پر

ہیں نقشِ کاغذی غالبؔ کے پائیدار بہت
گئے ہیں چھوڑ کر ایسے نشان کاغذ پر

زمینِ فکر پہ اُن کی بلندیاں دیکھو
اُتار لائے ہیں وہ آسمان کاغذ پر

ہمارے حرف کریں گے مکالمہ تم سے
کہ دی ہے لفظ کو ہم نے زبان کاغذ پر

وہ سامنے ہیں مرے، ہم کلام بھی مجھ سے
ہوا ہے کیسا یہ مجھ کو گمان کاغذ پر

یہ دیکھ لو مرا شجرہ کہ کون ہوں، کیا ہوں
بسا ہوا ہے مرا خاندان کاغذ پر

نہ جانے کیا لکھا اُس نے جواب میں خط کے
لگا ہے کل سے اے شاہینؔ دھیان کاغذ پر

❁

پھر آ گئی بہار، آؤ غزل کہیں
موسم ہے خوش گوار، آؤ غزل کہیں

وہ چھا گئی گھٹا، رم جھم کی ہے صدا
پڑنے لگی ہے پھوار، آؤ غزل کہیں

رنگین اور حسیں، کیا سج گئی زمیں
گلشن ہے لالہ زار، آؤ غزل کہیں

ہر شے پہ تازگی، ہر سمت دل کشی
کھلتے ہیں گُل ہزار، آؤ غزل کہیں

وہ حاصلِ نظر، آئے گا میرے گھر
اُس کا ہے انتظار، آؤ غزل کہیں

زیبائیٔ چمن، پھولوں پہ رقص زن
تتلی کی اِک قطار، آؤ غزل کہیں

یہ طائروں کا غول، اِن کے سریلے بول
پی پی کی ہے پکار، آؤ غزل کہیں

کیسی چلی ہوا، سب کچھ بدل گیا
دل کا گیا قرار، آؤ غزل کہیں

منظر وہ دل کشا، باقی نہیں رہا
ہے دل یہ سوگوار، آؤ غزِل کہیں

دورِ طرب گیا، اِک تازہ غم ملا
آنکھیں ہیں اشک بار، آؤ غزل کہیں

شاہیںؔ نہ ہو حزیں، منظر وہ دل نشیں
آئے گا بار بار، آؤ غزل کہیں

❁

ہر بشر شادکام ہو جائے
ہاں، اگر علم عام ہو جائے

تھا ادب میں کوئی مقام اُن کا
ایسے لوگوں میں نام ہو جائے

علم و فن کے جہاں ہیں شیدائی
اُس نگر میں قیام ہو جائے

کام کر لوں جو اپنے ذمّے ہے
زندگی پھر تمام ہو جائے

شوق سے آپ آئیں میرے گھر
پہلے کچھ اہتمام ہو جائے

عشق سے زندگی کا رشتہ ہے
ورنہ جینا حرام ہو جائے

پا لیں ہم جو حیات کا مقصد
زندگی کو دوام ہو جائے

زندگی جس نے بخشی ہے شاہیںؔ
بس اُسی کے یہ نام ہو جائے

میں زندہ ہوں اب تک تمھارے بِنا
عمارت ہے قائم سہارے بِنا

بڑھا درد حد سے تو آواز دی
نہیں چین آتا پکارے بِنا

عجب سحر آگیں ہے نقشِ نگار
اُترتا ہے دل میں اُتارے بِنا

ہے رمز و کنائے میں اب گفتگو
نہیں بات بنتی اشارے بِنا

اِنھیں سے تو ہے چرخ کی انجمن
وگرنہ فلک کیا ستارے بِنا

نہیں پیار کا انت، کوئی نہیں
یہ ہے ایک ساگر کنارے بِنا

اُسے کیا پتا، عشق ہے چیز کیا
وہ جیتا ہے بازی جو ہارے بِنا

نِہاروں تجھے جب، کہوں اِک غزل
غزل کیا ہو تجھ کو نِہارے بِنا

لگے مجھ سے کہنے عجب ناز سے
'غزل کہہ کے دیکھو ہمارے بِنا'

یہ اُفتاد بھی آ پڑی، دیکھ لو
غزل کہہ رہا ہوں تمھارے بِنا

وہ گزریں جو شاہینؔ چپ چاپ سے
میں کیسے رہوں پھر پکارے بِنا

پڑھتے رہیے کتاب کی صورت
ایسی ہے اک جناب کی صورت

اک حسیں جسم پر حسیں چہرہ
کھِل رہا ہے گلاب کی صورت

ہر حسیں نقش اُس کے چہرے کا
رٹ گیا ہوں نصاب کی صورت

اُن سے ملتے تھے، بات کرتے تھے
اب حقیقت ہے خواب کی صورت

وہ جو بچھڑا تو یہ ہوا محسوس
زندگی ہے عذاب کی صورت

جو ہے جانِ غزل، اُسی کے نام
ہے یہی انتساب کی صورت

پھیرے اُس کی گلی کے لگتے تھے
یہ تھی اپنے شباب کی صورت

ہو گیا ختم سلسلہ پھر بھی
ہے وہی اضطراب کی صورت

دوست اپنے اگر نہیں ہوتے
زیست ہوتی عذاب کی صورت

زندگی ہے عمل سے پائندہ
گرچہ ہے یہ حباب کی صورت

مثلِ خورشید ہم بھی جیتے تھے
تھے کبھی آفتاب کی صورت

علم ہو سب کے واسطے شاہیںؔ
ہے یہی انقلاب کی صورت

میں تو خلوص کا کبھی منکر نہیں رہا
ملتا اگر خلوص تو کہتا میں باوفا

کوئی نہ کام آیا مرے اُس کے ماسوا
میں اپنے دوستوں کو بھی دیتا رہا صدا

میرے ہی بھائیوں نے مجھے قتل کر دیا
گرچہ دیا رسول کا، اللہ کا واسطہ

یوں خانماں خراب رہے کوئی کب تلک
کب تک رہے گا جانے یہ ہجرت کا سلسلہ

تم سا عزیز تھا نہ کوئی اِس دیار میں
تم سے بچھڑ گیا تو میرے پاس کیا رہا

تیری تلاش میں رہا اے دوست عمر بھر
بن کر ہوا کی موج تجھے ڈھونڈتا رہا

جو داستان تھی وہ حقیقت میں ڈھل گئی
جو واقعہ تھا آج وہ افسانہ بن گیا

آتی ہیں یاد اب بھی پرانی وہ صحبتیں
گو ہم بدل گئے ہیں، زمانہ بدل گیا

ہم ہیں، سفر ہے اور ہے یہ دشتِ زندگی
ہے دھول سے لباس ہمارا اَٹا ہوا

اک آس دل میں ہے کہ جیے جا رہا ہوں میں
ظلمت کدے میں دوستو روشن ہے اِک دیا

مجھ پر محیط سوچ کا دریا ہے اِن دنوں
میں دیر سے ہوں آئینے کے سامنے کھڑا

دل کو کشادہ رکھو، ملیں گی مسرّتیں
شاہینؔ در ہو بند تو آتی نہیں ہوا

چھوڑ آئے وہ نگر، ہم کیا کہیں
جل رہے تھے اپنے گھر، ہم کیا کہیں

جا مسافر جا، یہاں سے دُور جا
کہہ رہا تھا ہر شجر، ہم کیا کہیں

قافلے والوں سے کچھ شکوہ نہیں
سو گئے پچھلے پہر، ہم کیا کہیں

آپ پر ہے بس ہنر کا خاتمہ
ہم کہ ٹھہرے بے ہنر، ہم کیا کہیں

بھول بیٹھے تھے گلی کو اُس کی ہم
اب وہی ہے رہگذر، ہم کیا کہیں

تیز لہجے میں جو اُس نے بات کی
سو نہ پائے رات بھر، ہم کیا کہیں

مدّعا اپنا جو تھا، ہم کہہ چکے
تم پہ ہے اب منحصر، ہم کیا کہیں

دل ہمارا کیسے اُس پر آ گیا
ہم بھی ہیں آخر بشر، ہم کیا کہیں

جو گزرتی ہے دلِ ناکام پر
آپ کو بھی ہے خبر، ہم کیا کہیں

اب کرائے کے مکاں ہیں اور ہم
تھا کبھی اپنا بھی گھر، ہم کیا کہیں

یہ کراچی شہرِ رنگ و نور تھا
لگ گئی کس کی نظر، ہم کیا کہیں

ہے بہت دیر آشنا شاہینؔ وہ
عمر اپنی مختصر، ہم کیا کہیں

یاد جب آتی ہے اُن کی دم بہ دم
اِک غزل ہو جاتی ہے تازہ رقم

آ گئے ہیں آج وہ گھر پر مرے
میں کہاں ناچیز، وہ اک ذی حشم

عشق سے تزئین بزمِ دوجہاں
عشق سے قائم ہے انساں کا بھرم

محفلِ احباب رشکِ صد چمن
یاد رکھیں کس لیے ہم بزمِ جم

دیکھ کر محفل میں اک تصویر کو
بن گئے حیرت کی خود تصویر ہم

انتہا تک آپ نے پہنچا دیا
آپ کا بھی مجھ پہ ہے کتنا کرم

جھوٹ کا ہو جائے جس پر شائبہ
کرتے ہیں تاریخ ایسی کیوں رقم

کہتے کہتے رک گئے ہم داستاں
ہو گئیں اُن کی حسیں آنکھیں جو نم

وہ بھی آئے ہیں عیادت کے لیے
اب سُکوں سے دوستو نکلے گا دم

یاد جب آیا ہمیں کرنافلی
چاندنی شب میں بہت روئے ہیں ہم

اُن سے اب شاہینؔ شکوہ کیا کریں
وہ بڑے ہی محتشم ہیں محترم

* چانگام کا مشہور دریا، جس کے کنارے اسی نام کا شہر آباد ہے۔

جس کو چاہا تھا، خدا کی شان ہے!
آج اپنے گھر وہی مہمان ہے!

وقت پر تو کام وہ آیا نہیں
جس سے اپنی جان اور پہچان ہے!

بڑھ گئی ہے اب مری مصروفیت
زندگی اب تو بہت آسان ہے!

اپنی محفل میں بلاتے ہیں مجھے
حُسن والوں میں مرا بھی مان ہے!

بے نیازانہ گزر جاتے ہیں وہ
آشنا ہونے کی یہ پہچان ہے!

جاگتی تھیں جس کی گلیاں رات بھر
شام ہی سے شہر وہ ویران ہے!

چھین کر بچّے کو ماں سے لے گئے
واپسی کی شکل اب تاوان ہے!

اُس کو بھی کہتے تھے سب 'پی آئی اے'
اب جو بنگلہ دیش کا 'بیمان' ہے!

ہر برا اصلاً برا ہوتا نہیں
نیک و بد کی اور بھی پہچان ہے!

اس لیے بھی یاد کرتا ہوں تجھے
بھول جانے کا بھی تو امکان ہے!

گوپیوں کا ہے یہاں میلا لگا
رادھیکاؤں کا یہی استھان ہے!

سرزمیں ایسی حسیں کوئی نہیں
خوب صورت سب سے پاکستان ہے

کس قدر شاہیںؔ ہے تسکینِ جاں
اُن کے ہونٹوں پہ جو اِک مسکان ہے!

دوستوں سے کہہ کے غم ہلکا کرو
بوجھ اپنے دل پہ مت رکّھا کرو

عشق کا اپنے نہ یوں چرچا کرو
اپنی خاطر مت اُسے رسوا کرو

ہر سخن ہے معتبر، ایسا نہیں
کہہ رہا ہے کون، یہ دیکھا کرو

سلسلہ رکھو تعلّق کا کوئی
بے غرض اتنے نہ بن جایا کرو

بے وفائی کا تمھیں شکوہ تو ہے
بے وفا وہ کیوں ہوا، سوچا کرو

زندگانی کے بھی ہیں آداب کچھ
تم تقاضے زیست کے سمجھا کرو

شہر ہے آشوب میں ڈوبا ہوا
بے ضرورت گھر سے مت نکلا کرو

جگمگاتا شہر کیوں گہنا گیا
بیٹھ کر فرصت میں یہ سوچا کرو

ہارنا بھی عشق میں اعزاز ہے
ہار کر بازی کبھی دیکھا کرو

وسعتوں کا ہوگا اندازہ تمھیں
آئینہ خانے سے تو نکلا کرو

عکس اُس کا آئے گا دل میں نظر
بند آنکھوں سے اُسے دیکھا کرو

ہے بلندی خاکساری میں نہاں
بات ہے نکتے کی یہ، سمجھا کرو

میں کہ ہوں اِک دشت میں جلتا شجر
تم تو ہو کالی گھٹا برسا کرو

اب نہیں موسم کا شاہیںؔ اعتبار
جاگتی آنکھوں سے تم سویا کرو

محبت کا یہ میری مرثیہ ہے
اِسے افسانہ کیوں سمجھا گیا ہے

جو تیرے حسن کا شیدا رہا ہے
وہ قصّے ہجر کے لکھتا رہا ہے

نہیں جو مندمل اب تک ہوا ہے
اِک ایسا زخم بھی دل پر لگا ہے

حسیں ہر شے بڑی دل کش فضا ہے
تمھارا شہر تو شہرِ سبا ہے

اُسے ہر شخص شاہیںؔ جانتا ہے
خبر ٹی وی پہ وہ پڑھتا رہا ہے

نہ ملنے کا بہانہ جانتے ہو
محبت کا سلیقہ آ گیا ہے

کبھی ہنستے، کبھی روتے رہے ہیں
یہی کچھ عشق میں ہوتا رہا ہے

اُسے جب سے تری قربت ملی ہے
بہت اچّھی غزل کہنے لگا ہے

دیے جب فال کے پیسے زیادہ
تو حسبِ حال توتا بولتا ہے

وفا کرتے رہیں اُس بے وفا سے
یہی آپس میں سمجھوتا ہوا ہے

بلائے پاس اپنے، اور مجھ کو!
سماعت کا مجھے دھوکا ہوا ہے

بہت ہے انتظار اُس کا مجھے کیوں
جو خط مجھ کو نہیں لکّھا گیا ہے

عجب تاثیر پروائی میں دیکھی
چراغِ آرزو جلنے لگا ہے

یہ ترا بانک پن، یہ رعنائی!
رشکِ مہتاب تیری زیبائی

حسن تیرا عجب کرشمہ ہے
ایک عالم بنا تماشائی

یاد آیا مجھے بدن تیرا
دُور قوسِ قزح جو لہرائی

جب سے شمعِ وفا جلائی ہے
انجمن بن گئی ہے تنہائی

یوں گزرتے ہیں دیکھ کر مجھ کو
جیسے مجھ سے نہیں شناسائی

عشق کی خودسپردگی دیکھی
خود تماشا بنا تماشائی

دیپ یادوں کے جل ہی جاتے ہیں
چھیڑ دیتی ہے جب بھی پُروائی

نشترِ غم نہ جس کو راس آیا
زیست اُس کو کبھی نہ راس آئی

اب وہ رُوے حسیں نظر آیا
اب چراغوں میں روشنی آئی

لوچ تیری صدا کا یوں اُبھرا
دُور بجتی ہو جیسے شہنائی

آرزو تیری دشمنِ جاں ہے
جاں سے گزرے ترے تمنّائی

جائیے، میں ہی بے وفا ٹھہرا
آپ کو کیوں کہوں میں ہرجائی

سچ کہا تو گرفت میں آئے
جھوٹ کی ہو گئی پذیرائی

میرے تینوں طرف فصیلیں ہیں
اور آگے ہے اِک بڑی کھائی

اُس نے توڑا یہ کہہ کے آئینہ
کیوں بنوں میں ترا تماشائی

چاند بن کر فضا میں لہراؤ
کتنی سُونی پڑی ہے انگنائی

چند ابتدائی

مطبوعہ غزلیں

وفاؤں کے بدلے دغا دینے والے
دُعا دے رہے ہیں دُعا دینے والے

اِدھر کی اُدھر کو لگا دینے والے
یہی تو ہیں فتنے جگا دینے والے

یہ خواہش ہے میری کہ پھر سامنا ہو
نگاہوں سے بجلی گرا دینے والے

نکلتی ہے اب بھی دُعا میرے دل سے
مرا آشیانہ جلا دینے والے

بہت دُور تم جا بسے ہو یہاں سے
مرے غم میں آنسو بہا دینے والے

وفا کی شکایت ہے مجھ کو تمھیں سے
کہاں ہو پیامِ وفا دینے والے

تمھیں دیکھنے کو ترستی ہیں آنکھیں
تغافل کی حد ہے بھلا دینے والے

پریشانِ فرقت ہے شاہیںؔ تمھارا
کہاں چھپ گئے آسرا دینے والے

بپتا کہیے تو سمجھیں گے بپتا کو افسانے لوگ
شہر میں ہر ہر موڑ پہ دیکھے اِس ڈھب کے فرزانے لوگ

دھوکا اپنے ہی دیتے ہیں، وقت بُرا جب آتا ہے
آ جاتے ہیں دُکھ میں اکثر کام یہاں بیگانے لوگ

ظلم کا اُن کو بھی تو کچھ احساس دلانا لازم ہے
آ جاتے ہیں صرف مجھی کو کیوں ناحق سمجھانے لوگ

میں نے از راہِ ہمدردی دیا سہارا گرتے کو
اُن کے میرے پیار کے کیوں گھڑ لیتے ہیں افسانے لوگ

سچّائی کے راہی کو ہے موت گوارا عزّت کی
حق کی خاطر پی جاتے ہیں زہر کے بھی پیمانے لوگ

ربط بڑھے تو کیسے آخر؟ خلق نہیں، اخلاص نہیں!
جانے پہچانے ہیں شاہیںؔ ظاہر یہ اَن جانے لوگ

کوئی تازہ غزل سُنا دو نا!
مست و بے خود مجھے بنا دو نا!

یہ غزل بھی حسین ہو جائے
مرے اشعار گنگنا دو نا!

دیکھ لو، سنگ دِل وہ کتنا ہے
قصّۂ غم اُسے سنا دو نا!

ہائے کس سادگی سے کہتے ہیں
بھول سکتے ہو گر، بھلا دو نا!

راہ میں پھر وہی ہے تاریکی
شمعِ اُمّید پھر جلا دو نا!

زندگی تو اُسی سے قائم ہے
زندگی کی اُسے دعا دو نا!

حکم رانی جہاں ہو اُلفت کی
ایسی بستی کوئی بسا دو نا!

راکھ ماضی کی مت کریدو تم
جو ہوا سو ہوا، بھلا دو نا!

بات بڑھتی ہے بات سے شاہینؔ
بات کو بس یہیں دبا دو نا!

❁

مجھے وہ نظر عطا کر، کرے جو ترا نظارا
کہ اِس آئینے میں دیکھوں میں تجھی کو آشکارا

یہ جو دل میں اِک خلش ہے، اُسے اتنا جانتا ہوں
مری زندگی کا حاصل، مری زیست کا سہارا

مری جان پر بنی ہے، چلے آؤ بھی خدارا!
بڑی بے بسی میں دل نے تمھیں آج ہے پکارا

میں اِسی چمن کا گل ہوں، نہیں فرق تم میں مجھ میں
مجھے اجنبی نہ سمجھو، مرے دوست تم خدارا

مرے شعروں میں ڈھلی ہے مری داستانِ ہستی
مرے شعر کر رہے ہیں مرے راز آشکارا

کہاں کھو گئی بصیرت، ہے کہاں خودی تمھاری
کہ تلاشتے ہو شاہیںؔ کسی غیر کا سہارا

ستم اِن کا بھی مجھ پر کم نہیں ہے
بہت ہیں غم مگر کچھ غم نہیں ہے

تری فرزانگی میں جانتا ہوں
مرا جوشِ جنوں بھی کم نہیں ہے

عجب بے کیف ایسی زندگی ہے
خلوصِ دل اگر باہم نہیں ہے

میں مثلِ شمع گھل کر جل رہا ہوں
کوئی میرا شریکِ غم نہیں ہے

ذرا دامن بڑھاؤ تو دکھا دوں
میری آنکھوں میں آنسو کم نہیں ہے

عیاں آنکھوں پہ ہیں سب رازِ بستہ
نگہ محتاجِ جامِ جم نہیں ہے

طبیعت میری کیوں گھبرا رہی ہے
مزاجِ یار تو برہم نہیں ہے

سبب گرنے کا شاہیںؔ کے یہی ہے
کہ وہ ملّت میں اپنی ضم نہیں ہے

❀

شوق کی منزل سے جب آگے گزر جاتے ہیں لوگ
پھر مکاں سے لامکاں کی سیر کر آتے ہیں لوگ

آرزو منزل کی دکھلاتی ہے یہ اعجاز بھی
رہنما کو چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں لوگ

کیا قیامت ہے کہ اپنی افسری کے زعم میں
خویش کو بیگانہ کہتے بھی نہ شرماتے ہیں لوگ

کُوئے جاناں میں جہاں جز خارِ حسرت کچھ نہیں
کیا خبر، پھر کس لیے، کیوں سر کے بل جاتے ہیں لوگ

ہم سے شاہیؔں اُن کا ملنا تھا فقط اِک اتفاق
بس یہی اِک بات افسانے میں لے آتے ہیں لوگ

مختصر کوائف:

نام: افتخار اجمل

تخلص: شاہیںؔ

والد کا نام: مولوی عبدالحنّان

تاریخِ پیدائش: ۱۰ر فروری ۱۹۴۱ء

جاے پیدائش: شیخ پورہ، ضلع شیخ پورہ، بہار

تعلیم: بی اے (آنرز)، ایم اے (فارسی)، ایم اے (اُردو)
سی ٹی، بی ایڈ، ڈی ایچ ایم ایس

ملازمت: تدریس، محکمۂ تعلیم
سبک دوش صدرِ شعبۂ اُردو
ڈی جے گورنمنٹ سائنس کالج، کراچی

مطبوعہ کتابیں: عقیدت کا سفر (۲۰۰۴ء)، شاعری کا سفر (۲۰۰۵ء)

زیرِ ترتیب: تنقیدی مضامین: 'آگہی کا سفر'، 'تجزیے اور تبصرے'
'اُردو افسانہ اور افسانہ نگار'
تذکرہ: 'دبستانِ خاور'
(دو جلدوں میں سابقہ مشرقی پاکستان کے ادبا وشعرا کا تعارف)
یادداشتیں: 'پردۂ ذہن پر اُبھرتے ہیں'
مجموعۂ نظم: 'چند نظمیں'

پتا: فلیٹ نمبر: جی ۹، صائمہ کلاسک،
گلشنِ اقبال، بلاک ۱۰ر اے، کراچی ۷۵۳۰۰

فون نمبر: ۴۸۰۱۶۱۵ (۰۲۱)



تصویر تو کرتی نہیں طینت کی وضاحت

شاہیںؔ ہے کیسا اُسے تحریر میں دیکھو

افتخار اجمل شاہیںؔ